اُردو میں جدید طنزیہ شاعری
ایک سماجیاتی مطالعہ

جاوید احمد ڈار

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو میں جدید طنزیہ شاعری : ایک سماجیاتی مطالعہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

''طنز و مزاح کی شاعری شعری ادب کا عظیم سرمایہ
اور شعریت کا جوہر ہے۔''

— پروفیسر گوپی چند نارنگ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو میں جدید طنزیہ شاعری
ایک سماجیاتی مطالعہ

جاوید احمد ڈار

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

©جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب	:	اُردو میں جدید طنزیہ شاعری ایک سماجیاتی مطالعہ
مرتّب	:	جاوید احمد ڈار
سائز	:	23x36/16
صفحات	:	124
اشاعتِ اوّل	:	2014ء
قیمت	:	250/روپے
ناشر	:	**نکبیر پبلکیشنز** سری نگر
سرورق	:	**TFC** سنٹر گاؤکدل سرینگر #2473818
طباعت	:	**الحیات** پرنٹوگرافرس، سرینگر 9419403126

Urdu Mein Jadeed Tanziya Shaayiri
Ek Samaajyaati Mutaala
by Javed Ahmad Dar

ISBN : 978-81-924010-5-8

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

انتساب

اپنے گھر والوں

کے نام

جن سے

اب تک

دور رہا

— جاوید احمد ڈار

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

فہرست

مقدمہ 9

ابتدائیہ 12

فصل اول

طنز و مزاح: معنی و مفہوم اور محرکات 15

فصل دوم

اردو میں طنزیہ شاعری کی روایت 32

(ابتدا سے جدید دور تک)

میر جعفر زٹلی 36، سودا 40، نظیر اکبرآبادی 47، غالب 50،

اکبرالہ آبادی 57، اقبال 74

فصل سوم

اردو طنزیہ شاعری کا جدید ترین دور 79

(نمائندہ شعراء کی روشنی میں)

شاد عارفی 84، سید محمد جعفری 87، ضمیر جعفری 94

راجہ مہدی علی خان 99، مجید لاہوری 101، ضامن جعفری 102

اختر شیرانی 103، دلاور فگار 104، رضا نقوی واہی 109

حاصل مطالعہ 114

کتابیات 119

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

مقدمہ

عہدِ حاضر ادب کے سماجی اور ثقافتی مطالعات کا عہد ہے۔ اس لیے کہ ادب خواہ کسی بھی زمین، تحریک یا رجحان سے وابستہ کیوں نہ ہو، اپنے معاشرہ اور اپنی ثقافت سے باہر نہیں ہوتا۔ اردو میں آغاز سے لے کر اب تک گرچہ متعدد رجحانات، رویے اور تحریکات منظر عام پر آئیں، لیکن کسی نہ کسی شکل میں ادب کا سماج سے رشتہ برقرار رہا۔ خاص طور پر جب ہم اردو کی طنزیہ شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ طنزیہ شاعری اپنا خام مواد لازمی طور پر اپنے سماج سے حاصل کرتی ہے۔ جعفر زٹلی سے لیکر اکبر الٰہ آبادی تک اور راجہ مہدی علی خان اور دلاور فگار سے لے کر اسرار جامعی تک تمام طنزیہ و مزاحیہ شاعروں نے سماج کی کج روی، نا مساعد حالات اور محترم و مثبت سماجی اقدار کی شکست وریخت کو ہی اپنی طنزیہ شاعری کا موضوع بنایا ہے لیکن طنزیہ شاعری کے لیے لازمی ہے کہ طنزیہ شاعر کا شعور پختہ اور بالیدہ بھی ہو اور مہذب و منظم بھی۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے اندر اصلاحی و تعمیری جذبات و تصورات کی بھی کمی نہ ہو۔ یہ خصوصیات جس طنزیہ شاعر کے اندر جس تناسب میں ہوتی ہیں، اُس کی طنزیہ شاعری اُتنی ہی عمدہ اور پر کشش ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی طنزیہ شاعر کے لیے اپنی زبان کی شعریات اور اپنے سماج کے اقداری نظام کی بھی بھرپور آگاہی ضروری ہے۔ زبان کی شعریات کی آگاہی اس لیے کہ شاعری طنزیہ ہو یا مزاحیہ، سنجیدہ ہو یا تبلیغی، اس کے لیے اپنی زبان کی شعریات کی پابندی لازمی ہے اور جس طنزیہ شاعر کے یہاں سماجی اور جمالیاتی شعور پختہ اور ترقی یافتہ نہیں ہوتا، اُس کی شاعری محض فقڈ بازی اور لطیفہ گوئی ہو کر رہ جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم جعفر زٹلی کی زیادہ تر طنزیہ شاعری میں دیکھتے ہیں جبکہ اکبر الٰہ آبادی کے یہاں اعلیٰ سماجی شعور بھی ملتا ہے اردو

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

شعریات کی آگاہی بھی اور شاعری کے تخلیقی اور جمالیاتی منصب کا شعور بھی۔اسی لیے اکبر الٰہ آبادی کی طنزیہ شاعری سماجی شعور کے اعتبار سے تو اعلیٰ حیثیت کی حامل ہے ہی، تخلیقی اور جمالیاتی اعتبار سے بھی خاص پرکشش ہے۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اب تک اکبر الٰہ آبادی سے بہتر طنزیہ شاعری کے نمونے اردو میں کم ہی سامنے آسکے ہیں۔لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ شعر و ادب کی تخلیق میں صرف تخلیق کار کی تخلیقیت کا ہی کردار ہوتا ہے بلکہ ہر عمدہ اور بڑا ادب مخصوص دور کے مخصوص سماجی اور ثقافتی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔دوسرے لفظوں میں ادب، ادیب نے ہی بلکہ اس کا عہد لکھواتا ہے، اس اعتبار سے جعفر زٹلی سے لے کر اکبر الٰہ آبادی تک پھر راجہ مہدی علی خان اور دلاور فگار سے لے کر رضا نقوی واہی تک اور ان سے آگے اسرار جامعی تک ہمارے معاشرے نے سماجی اور ثقافتی اعتبار سے کئی کروٹیں بدلیں ہیں۔کلاسیکی دور کی روایت پسندی 1857ء کے بعد کی علی گڑھ تحریک اور آریہ سماجی تحریک، برہمو سماج کی تحریک، ہندوستان کی جنگ آزادی، حب الوطنی کا رجحان، برطانوی حکومت کی Divide & Rule کی سیاست، دو عظیم جنگیں، ترقی پسند تحریک، مسلم لیگ اور کانگریس کی سیاست، ہندو مسلم تنازعہ دو قومی نظریہ، مطالبۂ پاکستان، تقسیم ملک، فرقہ وارانہ فسادات، ہجرت کا المیہ اور پھر ادبی سطح پر جدیدیت کا رجحان وغیرہ ایسے نکات ہیں جن کا تعلق سماجی تبدیلیوں سے تو ہے ہی ان تبدیلیوں کے زیرِ اثر انسانی نفسیات پر مرتب ہونے والے اثرات سے بھی ہے۔اس پورے منظر نامے میں بنیادی طور پر انسان کے فکری انتشار اور سماجی و تہذیبی کشمکش وغیرہ کو ہی مرکزیت حاصل رہی ہے۔گرچہ 90-1980 کے بعد اردو ادب میں مابعد جدید تھیوری کے ارتقاء کے بعد یہ تصور عام ہوتا جا رہا ہے کہ صرف ادب ہی نہیں زندگی کو بھی صحیح اور تعمیری سمت عطا کرنے کے لیے تھیوری یا نظریہ سازی ناگزیر ہے۔پروفیسر گوپی چند نارنگ نے 1993ء میں ہی اپنی تصنیف ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' میں تھیوری کی ناگزیریت پر تفصیل سے بحث کی ہے اور جہاں تک اردو کی طنزیہ شاعری کا تعلق ہے اردو کے طنزیہ شاعروں نے اپنی اپنی سطح سے سماجی شعور سے کام لیتے ہوئے سماج، ثقافت، زندگی، زمانہ اور ادب و فن

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

وغیرہ کے بارے میں طنزیہ لب و لہجے میں اپنے اپنے نظریات وتصوریات یعنی تھیوریز کو ہی بیان کیا ہے۔بے شک ان میں کوئی فلسفہ نہیں اور نہ ہی ان کی کوئی ٹھوس، حتمی اور مستقل حیثیت ہے لیکن ان کی طنزیہ شاعری میں جس سماجی شعور کا مظاہرہ ہوا ہے، اُس کی روشنی میں صدیوں کے سماجی اور تہذیبی انتشار و بحران کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے۔جاوید ڈار نے اپنی تصنیف ''اردو میں جدید طنزیہ شاعری : ایک سماجیاتی مطالعہ'' میں اسی حقیقت کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔اس ضمن میں جاوید احمد نے مختلف شعراء کے جو طنزیہ اشعار درج کیے ہیں وہ اُن کے حسنِ انتخاب کی گواہی دیتے ہیں۔جاوید احمد نے یہ کتاب محنت سے اور پورے تحقیقی وتنقیدی شعور کے ساتھ ترتیب دی ہے، انھیں اس کی داد ملنی چاہیے۔

پروفیسر قدوس جاوید
سابق صدر شعبۂ اُردو
کشمیر یونیورسٹی سرینگر
ایمریٹس فیلو یو۔جی۔سی۔دہلی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ابتدائیہ

سماجی شعور کے بغیر طنز و مزاح نگار کا قلم اپنے جوہر نہیں دکھا سکتا، یہی وہ جوہر ہے جو طنز و مزاح والی شاعری کو دوسری اصناف سے ممتاز بنا کر کبھی طنز کا روپ دھارنے اور کبھی مزاح کا لبادہ اوڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسی لیے علمائے ادب مشرق و مغرب نے طنز و مزاح کی شاعری کو سنجیدہ شاعری سے عمدہ یا کم از کم ہم پلہ بتایا ہے۔ دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اردو زبان کا دامن بھی طنزیہ و مزاحیہ ادب سے خالی نہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو زبان کے طنزیہ و مزاحیہ ادب نے نسبتاً قلیل عرصے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے تو غالباً یہ کوئی مبالغہ آمیز دعویٰ نہ ہوگا۔ مگر مقام افسوس ہے کہ ابھی تک اس سرمایہ کے تمام تر پہلوؤں کا سیر حاصل جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ بے شک اردو ادب میں طنز و مزاح پر بعض خیال افروز مضامین چھپے ہیں اور ہمارے بعض نہایت اچھے لکھنے والوں نے اردو ادب میں طنز و مزاح کا تاریخی یا تنقیدی جائزہ لینے کی بھی کوششیں کی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ امر شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اردو ادب میں طنز و مزاح پر کچھ اہم کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں، جن میں رشید احمد صدیقی کی ''طنزیات و مضحکات'' ڈاکٹر وزیر آغا کی ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' ابنِ اسماعیل کی ''اردو طنز و مزاح'' لیکن ان میں بھی طنز و مزاح کا جائزہ نثر کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ وزیر آغا نے البتہ اردو طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی طرف اپنی توجہ ضرور مبذول کی ہے لیکن ان کی یہ کوشش انتہائی ناکافی ہے۔ اس کمی کو دھیان میں رکھتے ہوئے راقم الحروف نے اس موضوع پر ایم فل کے لیے مقالہ لکھا جو اب ترمیم و تردید کے ساتھ کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ میری یہ کوشش کتنی صحیح ہے اور کتنی غلط، اس کا انحصار صرف اور صرف آپ پر ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

زیرِنظر کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے جس کا پہلا باب طنز و مزاح سے متعلق ہے۔ اس کے معنی و مفہوم نیز اس کی اہمیت اور نوعیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ ازیں طنز کس لحاظ سے مزاح سے الگ ہے، کا بھی سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس کے محرکات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا باب اردو میں طنزیہ شاعری کی روایت سے متعلق ہے۔ جس میں ابتدائی دور سے لے کر جدید دور تک کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے نیز اس دور میں جن شعرا کی وجہ سے اردو طنزیہ شاعری کا دامن وسیع ہوگیا اور جو حالات پیدا ہوگئے تھے، کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب اردو طنزیہ شاعری کے جدید ترین دور سے مخصوص ہے جس میں اس دور کے نمائندہ شعرا کا خصوصی مطالعہ بھی شامل ہے، پر بھی بحث کی گئی ہے۔

آخر میں حاصل مطالعہ کے تحت سارے ابواب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے تاکہ اردو طنزیہ شاعری کو ایک بار پھر مختصراً سمجھا جاسکے۔

اس کتاب کی تکمیل کے مراحل سے گزرتے ہوئے جن صاحب نظر اساتذہ سے اکتساب فیض کے جو مواقع ملے، وہ میری زندگی کے گزارلمحوں میں ایک دولت بے پایاں کی حیثیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے اس مقالے جو اب آپ کے سامنے کتابی صورت میں شائع ہوچکی ہے، کے بعض نازک موڑوں پر میری رہنمائی فرمائی۔

اپنے جن اساتذہ سے شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں ان میں پروفیسر محبوبہ وانی صاحبہ، پروفیسر مجید مضمر، ڈاکٹر فرید پربتی (مرحوم) اور میرے شفیق و رفیق استاد ڈاکٹر احمد محفوظ (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان سارے اصحاب کے زریں اور مفید مشوروں نے مجھے میری منزل آسان بنادی۔ ایک بار پھر ان سب کا شکریہ میں اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتا ہوں۔

اپنے والدین کے لیے میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں جن سے میں ان کو یہ کہہ سکوں کہ ''امّی جان، ابّا جان اور بھائی جان، آپ کا بیٹا آج اس قابل ہوگیا ہے کہ وہ ہر ایک

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

خوشی آپ کے قدموں تلے بچھا رہا ہے۔'' واقعی ان کی فراخ دلی اور حوصلہ افزائی کے بغیر یہ کتاب ہرگز مکمل نہ ہوسکتی تھی۔ ان کا تہہ دل سے اور اپنا حق اور فرض سمجھ کے ان کا شکرگزار ہوں۔

جاوید احمد ڈار

کولگام، کشمیر

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

طنز و مزاح: معنی و مفہوم اور محرکات

''طنز و مزاح کیا ہے؟ اس کی کوئی جامع تعریف کرنا مشکل ہے۔ اردو ادب میں اس کے تحت طنز، مزاح، ہزل، تمسخر، فقرے بازی، پیروڈی وغیرہ آتے ہیں''(1)

بقول رشید احمد صدیقی:

''بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو''(2)

طنز کے لیے انگریزی میں سٹائر(Satire) کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور سٹائر نام لا طینی سٹورا(Satura)سے نکلا ہے، جس کے اصلی معنی ''بھرے ہوئے'' کے ہیں اور دوسرے معنی مختلف چیزوں کے مکسچر ہیں۔

" The name 'Satire' comes from the latin word 'Satura' which means primarily full and then comes to mixture of full different things." (3)

یعنی

''طنز کا محرک ایک مرکب جذبہ ہوتا ہے۔ یعنی چوٹ کھائی ہوئی محبت کا سوز، درد، پامال آرزوں اور امیدوں کی تلخی، مایوسی غم و غصہ، نفرت و حقارت، جو برائی اور بد نمائی کو دیکھ کر محسوس ہو، شعوری اور غیر شعوری طور پر اصلاح

---

1 ڈاکٹر طاہر تونسوی، طنز و مزاح۔ تاریخ و تنقید (ماہنامہ شانِ ہند، نئی دہلی، 1986ء)، ص7

2 رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامع نگر دہلی)، ص78

3 Gilbert Highet, "The Anotomy of Satire" P.234

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کا جذبہ"(1)

اچھا طنز ان سب کیفیتوں کے حسین امتزاج سے وجود میں آتا ہے جس میں تلوار کی سی کاٹ نہیں، نشتر کی چبھن ہوتی ہے اور اس ہمدردی اور محبت کا مظہر ہوتا ہے۔ جو طنز نگار کو اپنے نشانۂ طنز سے ہوتی ہے۔ جہاں تک اصلاح کا تعلق ہے، ضروری نہیں کہ ہر طنز نگار کا مقصد طنز سے اصلاح کا کام لینا ہو، لیکن جو لوگ اس کو اس مقصد کے لیے اختیار کرتے ہیں انھیں بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ خیال ہر دم رکھنا پڑتا ہے کہ مقصد کی لے اُبھرنے نہ پائے ورنہ طنز نگار کا وار خالی جائے گا۔

یوں بنیادی طور پر طنز میں بھی مزاح کا عنصر شامل ہے لیکن ان دونوں میں ایک باریک فرق بھی ہے۔ جو بقول رونالڈ کاکس۔

"مزاح نگار ہرن کے ساتھ بھاگتا ہے۔ لیکن طنز نگار کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے"

طنز نگار دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جن کے خیال میں دنیا کی زیادہ تر چیزیں نا مکمل ہیں اور ان میں تغیر و تبدل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کمیاں اور ایک طرح کی کجی انسانی ذات کا لازمی حصہ ہیں اور اس لیے یہ لا علاج ہیں۔ دوسرے وہ جو ان کمیوں، خامیوں اور ادھورے پن کو قابل علاج سمجھتے ہیں۔ وہ طنز کی اصلاح کا ذریعہ جانتے ہیں۔(2)

ان دونوں قسم کے طنز نگاروں کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ مگر ان کی کامیابی اسی پر موقوف ہے کہ وہ طنزیہ اسلوب کو کس کس طرح برتتے ہیں۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ طنز کا رُخ معاشرے کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کی طرف ہو تو اس کی اہمیت و افادیت مسلّم ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر وزیر آغا طنز کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کبھی تو یہ محض ایک فرد کو نشانہ تمسخر بناتی ہے اور کبھی اس ارتقائی منازل

---

1 ڈاکٹر سید عابد حسین، مضمون نگاری طنزیہ و مزاحیہ مضامین (غیر مطبوعہ)، ص 5

2 ساقی، طنز و ظرافت نمبر (اپریل 1945)، ص 25

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

پر پہنچ جاتی ہے کہ جہاں یہ انسان اور سماج کی مستقل حماقتوں اور عالمگیر ناہمواریوں کو طشت از بام کرتی ہے۔ انسان کو انسانیت سے قریب تر لانے میں مدد دیتی ہے''(1)

طنز کا کام تعمیر ہے، تخریب نہیں۔ اچھے طنز نگار کا مقصد زخمی کے زخموں کو (چاہے وہ افراد کے ہوں یا معاشرے کے) کریدنا نہیں، اس پر سے پردہ اُٹھانا ہے۔ وہ بے رحم نہیں بلکہ رحم دل معالج اور چارہ گر ہوتا ہے۔ اچھے طنز میں درد کی کسک کی زیریں لہریں ہوتی ہیں، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ''مزاح سے بیگانہ نہ ہو بلکہ کونین کو شکر میں لپیٹ کر پیش کرے'' کیونکہ مزاح کی چاشنی اور پیرائیہ بیان کی لطافت کے بغیر طنز استہزاء طعن اور دشنام بن جاتا ہے۔ کامیاب طنز وہ ہے جو ایک طرف درد کے احساس کا محرک ہو، دوسری طرف لطف و انبساط اور ہنسی کی لہر بھی پیدا کرے۔ ہنسنے کی صلاحیت تو انسان کو اللہ کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور یہ بھی اللہ کی طرف سے عطا کی ہوئی ایک نعمت ہے۔ ہنسی احساسِ برتری کا نتیجہ ہے اور ادب کے ذریعے ہنسانے کا فن ظرافت کہلایا جاتا ہے، اس لیے وہ طنز جس میں ظرافت کا پہلو بھی شامل ہو، طنز و ظرافت یا پھر طنز و مزاح کے نام سے جانا جاتا ہے۔

جہاں تک ظرافت کا تعلق اس کی یہ تعریف ہے کہ کسی فرد یا جماعت یا معاشرے کے غیر متناسب رویوں اور طور طریقوں کو اس طرح بیان کیا جائے کہ لوگ اس سے محفوظ بھی ہوں اور اس کی طرف متوجہ بھی ہو جائیں اور یہ اس وقت ممکن ہے جب ظرافت نگار میں احساسِ ظرافت کے ساتھ ساتھ ذہانت بھی ہو کہ وہ کسی فرد یا معاشرے کے رویوں میں جو مضحک پہلو ہیں ان کو فوراً دیکھ لے اور ان کو مزاحیہ انداز میں بیان کر سکے، اس کو دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ:

''ظرافت وہ ہے جس میں کسی غیر متناسب چیز یا حرکت کی کھلم کھلا یا اشاروں میں ہنسی اُڑائی جائے۔ ظرافت یا ہنسی کا محرک وہ گدگدی ہوتی ہے جو

---

1 ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح (ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2007ء ترمیم شدہ ایڈیشن)، ص 51

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

بھونڈے اور بے تکے پن کو دیکھ کر اُٹھتی ہے اور اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ دوسروں کے احساسِ تناسب کو گدگدا کر ان کے دل میں انبساط کی لہر پیدا کرے"(1)

ظرافت سے سرور و انبساط تو حاصل ہوتا ہی ہے، اس کے علاوہ سماجی خرابیاں بھی منظرِ عام پر آتی ہیں۔ ظرافت نگار جب کسی بدی کا مذاق اُڑاتا ہے تو ہنسی مذاق کے پردے میں یہ مقصد بھی کارفرما ہوتا ہے کہ اس بدی سے نفرت ہو جائے اور اسے جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی خواہش ہر قاری کے دل میں پیدا ہو جائے۔ میریڈتھ کا قول ہے کہ:

"کامیاب ظرافت وہ ہے جو ہنسائے لیکن ساتھ ہی فکر کو بیدار بھی کرے"۔

اس میں شک نہیں کہ طنز اور ظرافت اکثر ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں، شاید اس لیے عام طور سے ان دونوں میں فرق نہیں کیا جاتا اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی مضمون طنز پر تب تک مکمل اور جامع نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ ظرافت کا ذکر نہ ہو۔ طنز ظرافت سے بالکل الگ چیز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا ظرافت سے تعلق ہے اور یہ تعلق بہت شدید اور گہرا ہے لیکن طنز کا مفہوم کچھ اور ہے۔ طنز ایک طرح کی تنقید ہے۔ تنقید کئی طرح کی ہوتی ہے۔ تنقید میں ایک چیز کے اچھے اور بُرے دونوں پہلو سامنے آتے ہیں اور نقاد دونوں پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔ تنقید ہمدردانہ ہوتی ہے۔ توازن اس کی ایک بڑی خصوصیت ہے، جب کہ طنز میں چیز کے بُرے پہلو نمایاں کر کے دکھائے جاتے ہیں۔ اس میں تنقید کا اعتدال قائم رکھنا اس لیے دشوار ہوتا ہے کہ یا تو چیز کے اچھے پہلو خود بخود نظر انداز ہو جاتے ہیں یا بُرے پہلو اس قدر چمکا کر پیش کیے جاتے ہیں کہ اچھے پہلو ماند پڑ جاتے ہیں اور ایک عام قاری کی نظر ان تک نہیں پہنچتی۔ طنز میں جتنی شدّت ہوتی ہے اتنا ہی وہ کامیاب اور بھرپور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن طنز کی یہ شدت اچھے اور بُرے مقصد کے لیے ہوتی ہے، اسی لیے طنز کی ادب میں اہمیت اس کی مقصدیت کی وجہ سے ہے اور یہی مقصدیت

---

1 ڈاکٹر عابد حسین، مضمون نگار کی طنزیہ و مزاحیہ مضامین غیر مطبوعہ ص 5

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہے جس کی وجہ سے طنز کی تلخی گوارا کر لی جاتی ہے۔ بقولِ غالبؔ، لب کی شیرینی کا کرشمہ ہے کہ اس کی گالیاں کھا کے ہم بے مزہ نہیں ہوتے۔ لب کی یہ شیرینی طنز کا مقصد ہے۔ اس لحاظ سے طنز عام ادبی تنقید سے بلند ہے۔

طنز کی کئی شکلیں ہیں جن میں وہ رونما ہوتا ہے۔ طنز میں تلخی اور شدت ہے۔ اس لیے ادب میں اس کے لیے خاص خاص اسالیب و بیان اختیار کیے گئے ہیں۔ طنز کی کڑوی کیلی گولیاں ان اسالیب کے لطف و چاشنی کی مدد سے حلق سے اتاری جاتی ہیں۔ مزاح ان میں سب سے اچھا اور پُر لطف پیرایہ بیان ہے جو طنز کی روح کے لیے مناسب ہے اور اس کے مزاج کے لیے ساز گار بھی ہے۔ انشا پردازوں نے طنز کے نشتروں کو ان کی ظاہری تیزی اور زہرناکی کا اثر ہلکا کرنے کے لیے ہی مزاح کے رنگ میں پیش کیا۔ مزاح کے زیر اثر قاری پر ایک نیم شگفتگی کی حالت میں خاموشی کے ساتھ طنز کا نشتر اپنا کام کر جاتا ہے۔

طنزیہ شاعری کے محرکات

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو طنزیہ شاعری وجود میں کیسے آئی اور کیوں آئی۔ اس کے محرکات کیا تھے جس نے اردو طنزیہ شاعری کو ہوا دی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف انگریزوں کی لوٹ مار، مرہٹوں کی یلغار اور پٹھانوں کے حملے جو ملک کو تاخت و تاراج بھی کر رہے تھے لیکن یہ حادثات ملک کے باشندوں کی سیاسی یا سماجی طور پر بیدار کرنے میں نہیں ہوتے۔ اس کی بڑی وجہ وہ شکست خوردہ ذہنیت ہے جو قومی کردار پر مسلط ہو چکی تھی اور جس کے منحوس سائے میں یہ لوگ سسکتے، بلکتے، چیختے چلاتے گذر اوقات کرتے چلے جاتے ہیں مگر ہاتھ پاؤں ہلانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے اور آزادی کی سخت کوشی پر غلامی کی تن آسانی کو ترجیح دینا پسند کرتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ اس انتشار اور سراسیمگی کی صورت میں ظاہر ہوا جو 'اودھ پنچ' سے پہلے کی تمام فضا پر محیط ہے۔ اس فضا میں ایک پٹی ہوئی سلطنت اور ایک لٹی ہوئی بے برگ و بار سوسائٹی نظر آتی ہے اور ایک ایسی جھنکار سنائی دیتی ہے جو شکست و ریخت کا لازمی نتیجہ ہے اور جسے اصطلاح عام میں ''فریاد'' کہتے ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

فریاد کی یہ لے اس دور کے اردو ادب کا بھی امتیازی نشان ہے اور چونکہ اس دور کا بیشتر ادب شاعرانہ کاوشوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ لہٰذا اس زمانے کے شعرائے کرام کے اشعار میں قنوطیت کی موجوں کو متحرک دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر فضا کی تیرگی اور ماحول کی یاس انگیز کیفیت کا ایک یہ نتیجہ بھی نظر آتا ہے کہ اس دور میں کچھ شعراء فرار کی طرف مائل ہوگئے ہیں اور کبھی اپنے تندو تیز جذبات کی تسکین کے لیے زاہد سے چھیڑ چھاڑ، ہجو اور معاصرانہ چشموں کی طرف اور کبھی اپنے انفعالی رجحانات کے زیر اثر ریختی کی جانب متوجہ نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس دور میں ایسے شعراء بھی دکھائی دیتے ہیں جو ماحول پر اپنے لطیف طنزیہ اشعار سے بڑی کاری ضربیں لگانے اور زندگی کی کرختگی کو اپنی زندہ دلی اور وسیع القلبی سے قابلِ برداشت بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن ایسے شعراء کی تعداد بہت کم ہے۔

اردو شاعری میں طنز و مزاح کے اس دور کی ایک نمایاں رَو واعظ محتسب اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ اور شگفتگی رندی و بے باکی کی رَو ہے۔ زاہد سے چھیڑ چھاڑ کے سلسلے میں مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> ''فارسی غزل گوئی میں یہ مضامین (زاہدوں اور واعظوں کی پردہ دری تاریخی حیثیت سے پیدا ہوئے۔ یعنی قدیم زمانے میں جب اسلامی سلطنت قائم تھی اس وقت محکمۂ احتساب بھی قائم تھا جس کا کام تمام مذہبی اور اخلاقی جرائم پر دارو گیر کرنا تھا اس لیے جب آوارہ مزاج لوگوں پر اس محکمہ کے افسروں کی طرف سے جو زیادہ تر مذہبی لوگ ہوتے تھے، دارو گیر ہوتی تھی تو ان لوگوں میں جو شاعر ہوتے تھے وہ اشعار کے ذریعے اس کا انتقام لیتے تھے .....اردو شاعری میں اس قسم کے رندانہ خیالات محض فارسی شاعری کی نقل و تقلید سے آئے''(1)

اس اقتباس سے جہاں ہمارے ذخیرۂ علم میں یہ قیمتی اضافہ ہوتا ہے کہ ہجو کی طرح زاہد سے چھیڑ چھاڑ کا تصور بھی فارسی سے مستعار ہے، وہاں اس بات پر حیرت بھی ہوتی ہے کہ مولوی صاحب نے اس چھیڑ چھاڑ کو محض شاعر کی آوارہ مزاجی اور جذبۂ انتقام کا کوئی

1 عبدالسلام ندوی، شعر الہند، جلد اول (انجمن ترقی پسند مصنفین، دہلی، 2004ء)، ص 378

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ قدیم ایران نے اسلامی یلغار کو پسند نہ کیا اور ایرانی جذبہ جس کا بہترین اظہار شاعری کے پیرائے میں ہوا۔ اس یلغار اور اس کی عائد کردہ مذہبی پابندیوں سے مشتعل ہو کر ردِعمل پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن اگر غور کریں تو اس طویل عرصے میں زاہد اور محتسب سے چھیڑ چھاڑ آزاد منش آدم کا وہ ردِعمل تھا جو اس نے سماج کی طرف سے عائد کردہ اخلاقی اور سماجی بندشوں کے خلاف ہمیشہ سے قائم کیا اور جس کی مدد سے اس نے ان پابندیوں کو اول توڑ پھوڑ دینے یا کم از کم ان کا مضحکہ اُڑانے کی ضرور کوشش کی۔ چنانچہ ان اشعار کی نفسیاتی وجہ محض شگفتگی طبع یا جذبۂ انتقام کا مظاہرہ نہیں بلکہ یہ زندگی کے بعض سنگلاخ قوانین اور جذباتیت سے سینچی ہوئی بعض اخلاقی قدروں کے خلاف آزاد منش قدم کے ایک نمایاں ردِعمل کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ مگر ان اشعار کی ایک اہم خصوصیت یہ ضرور ہے کہ یہاں شدت اور سنجیدگی کے بجائے ظرافت اور خوش طبعی کے عناصر کی فراوانی ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی لیے یہ قابلِ برداشت بھی ثابت ہوتے ہیں۔

رند اور زاہد کی اس کشمکش سے متعلق ایک اور خیال انگیز نکتہ یہ ہے کہ زاہد زندگی کی تکرار اور یکسانیت کا نمایندہ ہے اور اسی لیے آداب و قواعد کے تحت ایک سپاہی کی طرح سر تسلیم خم کرنا ہی کامرانی کے لیے ضروری خیال کرتا ہے۔ اس کے برعکس رند میں انفرادیت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے تخلیقی صلاحیتیں بھی اسے حاصل ہوتی ہیں۔ نتیجتاً وہ بغاوت، جدت اور تخلیق کے علمبردار کی حیثیت سے زندگی کے رسمی قواعد و ضوابط کو بہ نظرِ تحقیر دیکھتا ہے اور زاہد کی میکانکی عمل کو خندۂ استہزاء میں اُڑا دیتا ہے۔[1]

''اودھ پنچ'' سے پہلے کی اردو شاعری میں زاہد سے چھیڑ چھاڑ کی رو اس نفسیاتی وجہ کے علاوہ اپنے زمانے کے سماجی بدنظمی، قنوطیت اور ماحول کے نت نئے قواعد و ضوابط کے خلاف ایک ردِعمل کے طور پر بھی نمودار ہوئی۔ دراصل اس طویل زمانے میں جمہوریت کے تصور کی عدم موجودگی اور قومی کردار کی بزدلی و ناکردگی کے باعث ملک کے ایک طبقے نے

---

1 برگساں کے قول کے مطابق ہم انسانوں پر اس وقت ہنستے ہیں جب ان کی لچک میکانکی عمل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

سیاسی و سماجی مسائل پر براہِ راست نکتہ چینی کے بجائے مقاومیت کمترین کا راستہ اختیار کیا اور اپنے جذبات کے تند و تیز بہاو کو ایک حد تک زاہد اور محتسب کی طرف بھی موڑ دیا۔ نتیجتاً ولی کے زمانے سے (جب اس کا آغاز ہوا) ریاض کے زمانے تک (جب اس نے خاصی شدت اختیار کر لی) اور پھر حالی و اقبال کے دور تک (جب انتہائی مہذب پیرائے میں زاہد کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی) یہ طریق کار کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے۔ تاہم ان کے اشعار میں زاہد اور واعظ اس قدر نمایاں ہیں اور ظرافت کے عناصر کی اتنی فراوانی ہے کہ وہ تلخی نظر ہی نہیں آتی جس نے اس دور کو ایک حد تک جنم دیا تھا۔

اردو طنزیہ شاعری کے محرکات صرف یہی نہیں تھے بلکہ اس سے آگے چل کر جو حالات پیدا ہوئے، وہ بھی ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔ 1857ء کی قیامت خیزیوں نے لوگوں کے ہونٹوں سے ہنسی چھین لی۔ اس حادثے نے سب کچھ تہہ و بالا کر دیا۔ ہر طرف ناکامی و نا اُمیدی کے آثار نظر آنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے لوگ نہ صرف معاشی، اخلاقی، ادبی، تمدنی حیثیت سے گرنے لگے بلکہ سیاسی طور پر بھی بچھڑنے لگے۔ اس وقت ضرورت تھی کسی ایسے رہنما کی جو قوم کو اس تباہی سے نکال دے، اس سلسلے میں سرسید احمد خان کا کارنامہ کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن انھوں نے شاعری کے بجائے نثر میں اپنے پیغام اور اپنے فلسفے سے اپنی مردہ قوم میں نئی جان ڈال دی جب کہ شاعری میں منشی سجاد حسین کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے رسالہ ''اودھ پنچ'' جو 1877ء میں جاری ہوا تھا، نے وہ کام کیا جو رات کی تاریخی میں آتش بازی کرتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی ادب خصوصاً انگریزی مزاح سے لوگ واقف ہو چکے تھے۔

انسانی کمزوریاں لوگوں کو ہنسنے کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ سماجی برائیاں اور اخلاقی خرابیاں ''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں کی نظر میں تھیں، ان کو طنز کا نشانہ بنایا گیا، ان کی ہنسی اُڑائی گئی اور اس طرح مذاق مذاق میں کام کی باتیں بھی ہو گئیں۔ اس اخبار کے ذریعے ملک میں ظرافت کا ذوق عام ہوا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے صحیح کہا تھا کہ۔

''جب معاشرہ بھوکا ہو تو اس میں طنز و مزاح کو فروغ ملتا ہے اور تخریب و

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

نشتریت اور برہمی کے عناصر اُبھرتے ہیں۔ دوسری طرف فارغ البالی کے دور میں ماحول سے یگانگت اور اُنس بڑھ جاتا ہے اور اس لیے خالص مزاح کو عروج نصیب ہوتا ہے۔"(1)

"اودھ پنچ" نے بھی بالکل یہی راستہ اپنایا تھا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ "اودھ پنچ" نے جس زمانے میں آنکھ کھولی وہ اس کے نمو و ارتقاء کے لیے مناسب ترین وقت تھا۔ ہماری سماجی، معاشی، سیاسی و مذہبی زندگی میں یکا یک ایک ایسا جذباتی اندازِ نظر کارفرما ہو گیا تھا جس سے ذہنی توازن کا یکسر فنا ہو جانا غیر اغلب نہیں تھا۔ ایسے میں اودھ پنچ نے اپنے اصلی روپ میں نمودار ہونے کی زبردست تحریک چلائی اور طنزیاتی لب و لہجہ اختیار کر کے اس اخبار کو وسعت بخشی۔ اس اخبار میں یوں تو بہت سارے ادیب و شاعر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے لیکن اکبر الٰہ آبادی وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے طنزیہ لہجہ اپنا کر ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی جسے لوگ اپنے زخموں کا مرہم سمجھنے لگے۔

اودھ پنچ سے پہلے یعنی غدر کے ہنگامے نے نہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کی آخری دیوار ہی کو گرا دیا تھا بلکہ پرانے سماج کی تمام بنیادوں کو بھی متزلزل کر دیا تھا۔ مغربی علوم، مغربی معاشرت اور مغربی تہذیب کے اثر سے اب ایک ایسا معاشرتی انقلاب رونما ہوا تھا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو ابھی تک پرانی اقدار کا ساتھ دے رہے تھے اور نئے ماحول اور نئے خیالات سے کوئی ذہنی سمجھوتہ کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ ان لوگوں میں قدامت پسند مولویوں اور برہمنوں کا وہ طبقہ خاص طور پر زیادہ مشتعل تھا جس کو پرانے نظام میں تو ایک خاص مرتبہ حاصل تھا لیکن جو نئے حالات میں تیزی سے نظر انداز ہو رہا ہے۔ چنانچہ یہ طبقہ ان جدید مغربی اثرات کا سب سے زیادہ مخالف تھا۔

"دوسری طرف وہ لوگ تھے جنھیں اپنے قومی کردار کی کمزوری اور پستی کا ہی احساس نہیں تھا بلکہ جو ان کیفیتوں کا اصل موجب اس قدامت پسند ذہنیت کو گردانتے تھے جو ہر ترقی پذیر رجحان کو انتہائی شد و مد کے ساتھ روکتی ہے اور

---

1 ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح (ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2007ء، ترمیم شدہ ایڈیشن)، ص 44

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کسی قسم کی سماجی یا ذہنی تبدیلی کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ ان لوگوں نے پرانے نظام کو مٹتے اور 1857ء کے غدر میں آخری ہچکی لیتے ہوئے دیکھا تھا"(1)

چنانچہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے اہلِ وطن ایک زوال پذیر معاشرت میں منجمد ہوکر رہ جائیں۔ اس کے علاوہ مغربی علوم سے آشنائی اور مغربی تہذیب کے قریبی مطالعے سے ان لوگوں میں اپنی تہی دامنی کا احساس پیدا ہوگیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ہوسکے دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں بالخصوص انگریزی قوم کے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر دنیوی ترقی میں برابر کے شریک ہوسکیں۔ مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوؤں میں یہ احساس بہت پہلے پیدا ہوچکا تھا۔ چنانچہ ہندو کالج کی تعمیر اور راجہ رام موہن رائے اور دیویندر ناتھ ٹیگور تحریک کے زیر اثر ہندوؤں میں مغربی علوم کے حصول کا رجحان خاصا توانا ہوچکا تھا۔ تاہم غدر کے بعد مسلمان تیزی سے اس راستے پر گامزن ہونے لگے۔ 1863ء میں نواب عبداللطیف نے محمڈن لٹریری سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی جس کا مقصد مغربی تہذیب کا خیر مقدم تھا۔ ادھر سرسید احمد خان نے مغربی تہذیب کو نہایت قریب سے دیکھا تھا اور وہ اب چاہتے تھے کہ مسلمان صدیوں کی قعر مذلت سے نکل کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوجائیں۔ چنانچہ سرسید نے اپنی زندگی اس عظیم کام کے لیے گویا وقف کردی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں پر یہ ثابت کردیا جائے کہ مغربی تہذیب کا اختیار کرلینا قرآن کی تعلیم کے منافی نہیں ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اسلام کو ایسے رنگ میں پیش کرنے کے متمنی تھے کہ اس کے اور مغربی افکار کے درمیان کوئی نمایاں خلیج باقی نہ رہے۔ بنیادی طور پر ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان بغیر کسی حیل و حجت کے مغربی تہذیب اور مغربی افکار کو اپناتے چلے جائیں۔ سرسید اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ انھیں شروع ہی میں ایسے ساتھی مل گئے جنھوں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مولوی چراغ علی، نواب محسن الملک، مولانا حالی وہ قابل ذکر نام ہیں جنھوں نے سرسید کے مشن کو آگے بڑھایا۔ لیکن حالی کا اندازِ نظر سرسید سے قدرے مختلف تھا۔ سرسید کے ہاں مغربی رجحانات ہی اس کی

---

1 غلام احمد فرقت کاکوروی، اردو ادب میں طنز و مزاح، ص 89

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

منزل ہے اور وہ مسلمانوں کو اس منزل تک رسائی دلانے کے لیے ایک خاص سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ لیکن حالؔی مسلمانوں کی زبوں صورتِ حال پر ایک نئے زاویئے سے حملہ آور ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اصل زوال کی وجہ ان کا اسلامی معیار سے منحرف ہونا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان پھر سے اسلام کی خالص قدریں قبول کریں او رایک سادہ و باوقار زندگی بسر کرنے لگ جائیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے جہاں انھوں نے ماضی کی تصویریں عبرت کے لیے پیش کی ہیں اوراخلاقی معیار پر خاص طور سے زور دیا ہے وہاں بعض اوقات طنز اور مزاح کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا۔ مثلاً علمائے زماں کے بارے میں کہتے ہیں:

جو چاہے کہ خوش ان سے مل کر ہو انسان تو ہے شرط وہ قوم کا ہو مسلمان
نشاں سجدے کا ہو جبیں پر نمایاں تشرع میں اس کے نہ ہو کوئی نقصان

بسیں بڑھ رہی ہوں نہ داڑھی چڑھی ہو
آزاد اپنی حد سے نہ آگے بڑھی ہو

تاہم یہ حقیقت ہے کہ حالؔی کے کلام پر سنجیدگی اس درجہ مسلّط ہے کہ ان کی طنز میں مزاح کے عناصر بڑی حد تک دب کر رہ گئے ہیں۔ بہر حال اس امر سے قطع نظر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دوسروں کی طرح حالؔی نے بھی اپنی زوال پذیر معاشرت کو بے نقاب کیا ہے لیکن اس کام کے لیے انھوں نے اپنی تہذیب کا مغربی تہذیب سے موازنہ نہیں کیا۔ (جیسا کہ سر سید اسکول کے بعض لکھنے والوں نے کیا) بلکہ اسلام کے عہدِ زرّیں سے مقابلہ کیا ہے۔ چنانچہ دوسروں کی بہ نسبت حالؔی اپنے مشن میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ذکر ہوا ہندوستان کی تاریخ کا یہ دور مختلف رجحانات کے تصادم کا دور تھا۔ تاہم اس دور میں مغربی تہذیب کو اپنانے کی روش ہی سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ صدیوں کے منجمد معاشرے میں یکا یک ایک ایسا اندرونی تموج پیدا ہو گیا تھا کہ ملک کا باشعور طبقہ اندھا دھند مغربی افکار کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کا مقلد بھی ہونے لگا تھا۔ جذباتیت کی رو اپنے عروج پر تھی۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو کسی تبدیلی کے متحمل نہیں ہو

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

سکتے تھے۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو اپنی روایت اور تہذیب کا دامن چھوڑنے پر آمادہ تھے اور ان دونوں طبقوں کا انداز کسی نہ کسی حد تک جذباتی تھا۔

> ''اودھ پنچ' کے معرضِ وجود میں آنے کے لیے یہ مناسب ترین وقت تھا کیونکہ ان دونوں طبقوں کے جذباتی ردِّ عمل کو ہدفِ طنز بنانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی تاکہ ان کے اعمال میں کسی نہ کسی حد تک توازن پیدا ہو سکے۔ چنانچہ اودھ پنچ کو یہ تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ اس نے جہاں مغرب کی اندھا دھند تقلید کو ہدفِ طنز بنایا وہاں اپنی معاشرت کے زوال پذیر عناصر کا مضحکہ بھی اُڑایا اور یوں فضا کو اعتدال پر لانے کی بھرپور کوشش کی'' (1)

1857ء کی بغاوت اور ملک میں پھیلی ہوئی افراتفری، بے اعتدالیاں، بدعنوانیاں بھی وہ بنیادی مسائل تھے جنھوں نے اردو طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو جنم دیا اور اس وقت طنز و مزاح کا سب سے بڑا محرک اس وقت کی ملکی سیاست اور سماجی فضا تھی۔ معاشرے میں انتشار کی کیفیت تھی۔ لیکن انتشار کی یہ کیفیت آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ غدر کے بعد بدلتے ہوئے معاشرہ نے کلچر کے بطن سے جنم لے لیا تھا۔ یعنی رہن سہن، رکھ رکھاؤ اور بول چال کے وہ آداب اور محاسن جو پہلے صرف خواص تک محدود تھے (اور جو مختصراً اس عہد کا کلچر تھا) اب فاصلوں کے کم ہونے، شہری آبادی کے بڑھنے اور ملکی مجلسی روابط کے وسیع ہونے سے عوام میں پھیلنے لگے (اور یوں تہذیب کی صورت میں نمودار ہوئے) اس بات نے جہاں عام سماجی زندگی کو اس طور بدلا کہ سوسائٹی کی اقدار اور اخلاقی و مجلسی ضوابط کا اطلاق وسیع ہوا وہاں اس کے باعث فرد اب سوسائٹی کا مرکز نہ رہا بلکہ سوسائٹی خود اپنا مرکز بن گئی اور فرد اس سوسائٹی میں اس طور ضم ہونے لگا گویا وہ کسی بہت بڑی مشین کا ایک ادنیٰ پُرزہ تھا۔ ادب اور بالخصوص شاعری پر اس نئی صورتِ حال کا ایک خاص اثر ناگزیر تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں ایسا ادب پیدا ہوا، جو یا تو سماجی اقدار اور مجلسی اور مذہبی ضوابط کا انتہائی سنجیدگی سے علمبردار تھا اور یا عوام کی تفریح طبع اور تنقیدی حس کی تسکین کے

---

1 خواجہ عبدالغفور، طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ (ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1983ء)، ص 107

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

لیے مناسب تھا۔ اول الذکر کے علمبرداروں میں مولوی نذیر احمد (نثر کے سلسلے میں) اور مولانا حالؔی (شاعری کے سلسلے میں) سب سے زیادہ پیش پیش تھے اور موخر الذکر کے علمبردار 'اودھ پنچ' کے دور کے وہ سب لکھنے والے تھے جو مزاح، بذلہ سنجی اور طنز کے رسیا تھے اور جن کے مخاطب خواص نہیں بلکہ عوام تھے۔ ویسے بھی اس میں کوئی کلام نہیں کہ سماج ہم سے شخصی اور ذاتی اُلجھنوں کے اظہار کی بجائے اس بات کا متوقع ہوتا ہے کہ ہم اس کی تفریح طبع کے لیے سامان بہم پہنچائیں اور اپنی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی سے اس کا دل موہ لیں۔ چنانچہ سوسائٹی میں ہر دلعزیز ہونے کے لیے فرد میں ان خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عذر کے بعد یکا یک ایک ایسی سوسائٹی معرض وجود میں آگئی تھی جس کے تقاضے عذر سے پہلے کے زمانے سے مختلف تھے اور جس میں کامیاب ہونے کے لیے شاعر کا زخم ہائے دل کو عریاں کرنا اتنا فائدہ مند نہیں تھا جتنا اپنی بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور طنز سے اس کا دل موہ لینا۔ چنانچہ اس زمانے کی شاعری میں طنز و مزاح کے یکا یک رواج پانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا اس زمانے کی اردو شاعری میں طنز و مزاح کے رواج دینے کا سہرا 'اودھ پنچ' کے سر ہے۔

'اودھ پنچ' کے اشاعت پذیر ہوتے ہی فضاء قہقہوں سے لبریز ہوگئی۔ طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ذریعے لوگوں کے زخموں کو مرہم لگایا گیا۔ طنز و مزاح کا ایک سیلاب تھا کہ مسکراہٹوں کو اپنے جلو میں لیے امڈا اور چاروں طرف پھیل گیا اور شاعروں اور مضمون نگاروں کا ایک پورا گروہ طنز و مزاح کے حربوں سے ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو نشانۂ تمسخر بنانے لگا جن میں پنڈت تر بھون، ناتھ ہجرؔ، احمد علی شوق، مولوی سید عبدالغفور شہبازؔ اور اکبر الٰہ آبادی پیش پیش تھے۔ ہجرؔ نے تحریف پیروڈی سے اپنے اصلاحی مقصد کو آگے بڑھا کر کہیں طنز تو کہیں مزاح کو شامل کرا کے اپنا حق ادا کیا۔ شوقؔ نے اودھ کی کھوکھلی معاشرت اور اس کے نام لیواؤں کی بعض مکروہ عادات پر بھرپور طنز کیا، شہباز نے مذہب و ملت کو بھی بسا اوقات نشانۂ طنز بنایا اور اکبر الٰہ آبادی نے مغربی تہذیب وغیرہ کا تمسخر اُڑایا۔ ان طنز نگار شعراء کی طنز نے تعمیری کام ضرور سرانجام دیا، اگرچہ مغربی تہذیب

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کے سیلاب کو روکنا ممکن نہیں تھا اور نہ اس سیلاب کا رُک جانا ہی ہماری ترقی کے لیے سود مند تھا۔ تاہم اس سیلاب کی تندی اور شدت میں دھیما پن ضرور پیدا ہوا اور انھوں نے اپنے ملک کی ان ادبی، تمدنی اور مذہبی روایات کا تحفظ کیا جو بصورت دیگر یکسر فنا ہوجاتیں۔اس ضمن میں اکبرالہ آبادی کا وہ حصہ کلام بھی قابلِ توجہ ہے جس میں انھوں نے مغرب کو نشانۂ طنز بنانے اور مشرق کو ایک مقام بلند پر دکھانے کے بجائے ان دونوں میں توازن پیدا کرنے کا درس دیا۔ محمد احسن فاروقی کا خیال ہے کہ اپنے اس کلام کی بدولت :

''اکبر محض بدلتی ہوئی قدروں کے ترجمان سے آگے بڑھ کر دائمی قدروں کے طرفدار دکھائی دیتے ہیں''(1)

اکبر کے بعد شبلی اور ظفر علی خان نے ہنگامی واقعات اور اکابر کے طرزِ عمل پر طنزیہ شاعری کو جلا بخشی اور پھر ظریف لکھنوی نے ان سماجی بے اعتدالیوں کو نشانۂ طنز بنایا جو زمانے کے انحطاطی رجحانات سے جنم لیتی اور ہنگامی واقعات کے پسِ پشت زندہ و قائم رہتی ہیں۔مثال کے طور پر ان کی نظمیں 'سیاحتِ ظریف' 'شہرِ آشوب' 'الیکشن' سماج کی ان ناہمواریوں کو طشت از بام کرتی ہیں جو معاشرے کی سطحی واقعات کے پسِ پشت قائم ہیں اور پھر علامہ اقبال کے آتے آتے سماجی اور سیاسی شعور تقریباً ہر فرد میں نظر آنے لگا اس کی وجہ یہی تھی کہ علامہ اقبالؒ کی طنزیہ شاعری میں سنجیدگی اور ظرافت بدرجہ اتم موجود تھی چونکہ ظرافت اور سنجیدگی کا یہ امتزاج علامہ اقبالؒ کی فطری متحمل مزاجی اور اعتدال کا غماز ہے۔ پھر ان کے ہاں بالعموم ایک ایسا بالواسطہ انداز موجود تھا کہ طنز کی نشتریت تو قائم رہتی ہے لیکن کسی شدید ردِعمل کو تحریک نہیں ملتی۔ اس طریقِ کار کی ایک اچھی مثال ان کی نظم 'نصیحت' ہے جس میں انھوں نے طنز کرنے کے لیے ایک نیا زاویہ منتخب کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی طنز کو ان دائروں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو کسی حوض کی شفاف سطح پر ایک کنکر کے ارتعاش سے نمودار ہوتے اور حلقہ در حلقہ بڑھتے اور پھیلتے جاتے ہیں۔ چنانچہ:

''ان کی طنز کا پہلا نشانہ اپنی ہی قوم تھی۔لیکن یہاں وہ کہنے کی باتیں کسی

---

(1) محمد احسن فاروقی، اکبر، ص۔ (علی گڑھ کالج میگزین، 1950ء)، ص 107

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کھردرے اور نصیحت آموز انداز سے پیش نہیں کرتے بلکہ بڑے پیار اپنے پر شفقت ہاتھ ناظر کے شانوں پر رکھ دیتے ہیں اور جب باتیں کرنے لگتے ہیں تو نرم اور خوبصورت الفاظ کے غضب میں طنز کے زیر آلود تیر جھپٹتے چلے آتے ہیں اور ناظران کی چبھن کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے"(1)

"علامہ اقبال کی طنز کا دوسرا نشانہ مغربی تہذیب کی ساری بے اعتدالیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ وہ جب مغربی ہوا کے طوفانی تھپیڑوں سے اپنی تہذیب کے تناور درختوں کی ٹہنیوں کو ٹوٹتا ہوا دیکھتے ہیں تو بے اختیار ہو جاتے ہیں"(2)

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خون ہے یہ جوئے خون ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

میخانہ یورپ کے انداز نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

"علامہ اقبالؒ کی طنز کا تیسرا اور آخری دائرہ زندگی اور کائنات کے بہت سے مسائل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اقبال ایک مفکر کے دھیمے تبسم کے ساتھ کائناتی مسائل کے رموز و نکات کی تقسیم پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔خالق کائنات سے ان کا براہ راست خطاب اپنے اندر رندی و بے باکی کے علاوہ طنز کے بہت سے تیز نشتر بھی پنہاں رکھتا ہے اور اس کلام کے مطالعے کے بعد ناظر محسوس کرتا ہے کہ اس نے بہت بلندی پر سے زندگی کے نشیب و فراز پر ایک نگاہ ڈالی ہے۔(3)

---

1 ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح (ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2007ء ترمیم شدہ ایڈیشن)، ص 129

2 طارق سعید، اردو طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1996ء)، ص 113

3 خواجہ عبدالغفور، طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ (اڈارن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1983ء)، ص 187

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا؟
اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر
مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟

دوسری جنگ عظیم اور تقسیم ہند کے باعث ہمارے معاشرے میں بعض نئے رجحانات نے جنم لیا۔ اقتصادی بد حالی، ہجرت اور الاٹمنٹ کے قضیے، سیاسی زندگی کے شدید جزر و مد اور بین الاقوامی معاملات میں دو عظیم قوتوں کے مابین ایک سرد جنگ نے فضا میں ایک ایسی ہی سیمابی کیفیت پیدا کردی جو یقیناً ہمارے معاشرے کے لیے بالکل نئی ہے۔ چنانچہ ہمارے بعض طنز نگار شعراء نے ایک نئے طنزیہ لہجے سے ملکی اور بین الاقوامی بے اعتدالیوں کو منظر عام پر لانے کا آغاز کردیا۔ واقعہ ہے کہ آزادی کے بعد یعنی 1947ء کے بعد ہندوستانی زبانوں کے طنز و مزاح نگار اچانک ایک بڑے اور گھمبیر مسئلہ سے دوچار ہوگئے۔

> ''مسئلہ یہ تھا کہ طنز و مزاح کا ایک بڑا اور دیرینہ ٹارگٹ یعنی برطانوی اقتدار ان کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔ طنز کا یہ دیرینہ ٹارگٹ مرزا غالبؔ سے لے کر اودھ پنچ تک اور اودھ پنچ سے لے کر 1947ء تک مستقلاً برقرار رہا۔ اب ہندوستانی زبانوں کے طنز و مزاح نگاروں کو اپنے آپ پر ہنسنا تھا۔ اپنے زخموں کو خود کریدنا اور خود ہی ان کا مرہم بننا تھا۔ گویا ہندوستان کا طنز و مزاح نگار آزادی کے بعد خود ہی قاتل اور خود ہی مسیحا بن گیا''۔ (1)

آزادی کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں ایک زبردست تبدیلی آئی اور ایک نئے زاویہ نگاہ کی تلاش میں ساری قوم نے فکر و عمل کے ایک نئے سفر کا آغاز کیا۔ آزادی کا

---

1 مجتبیٰ حسین ''اردو طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ'' مشمولہ طنز و مزاح: تاریخ و تنقید از ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص 113

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

خواب پورا ہو چکا تھا اور اب حقیقت سامنے کھڑی تھی اگرچہ آزادی کی مسرت بڑی بے پایاں تھی مگر ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی شروع ہونے والے فسادات نے آزادی کے خواب کو جھلسا دیا اور سارے برصغیر میں افراتفری پھیل گئی۔ آزادی کے بعد پیش آنے والے واقعات نے ادیبوں اور فنکاروں کی ذمہ داریوں کو اور بھی گرانبار کر دیا۔ انھیں آزادی کے زخمی خواب کی تعمیر نو اور نگہداشت کرنی تھی۔ اصولوں اور سماجی اقدار کی اس شکست و ریخت نے ان کے فرائض کچھ اور بھی بڑھا دیئے۔ اس پسِ منظر میں اردو کے طنز و مزاح نگاروں کے ذہنی سفر کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اردو کے طنز و مزاح نگاروں نے اپنے آپ پر ہنسنے کی شرط کو نہ صرف پورا کیا بلکہ اس عمل کو ایک اعلیٰ پائے کا درجہ عطا کیا۔ انھوں نے نہ صرف نئے نئے ٹارگٹ تلاش کیے بلکہ طنز و مزاح کا اعلیٰ معیار بھی قائم کیا۔ اس ضمن میں شاد عارفی، مجید لاہوری، سید ضمیر جعفری، سید محمد جعفری، دلاور فگار، رضا نقوی واہی وغیرہ وہ اہم نام ہیں جنھوں نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ لہجے سے اس کمی کو پورا کرنے کی بھر پور کوششیں کیں جو اس وقت عالمی ادب کی پہچان ہے اور جدید اردو شاعری میں بھی یہ طنزیہ لے کافی نمایاں ہے خاص کر آج کے دور میں کیونکہ اب شاعری محض ہیئت کی بھول بھلیوں میں گرفتار نہیں ہے بلکہ اس کے سماجی انسلاکات بڑے مستحکم ہو چلے ہیں۔۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو میں طنزیہ شاعری کی روایت

(ابتدا سے جدید دور تک)

طنز کسی نامعقول صورت حال کے خلاف صرف جذبۂ احتجاج کا اظہار نہیں ہوتا اسے معقول یا بہتر بنانے کی خواہش کا اشاریہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن اپنے طرزِ اظہار میں اگر وہ دل کش نہ ہو، شگفتہ نہ ہو، اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا۔ اس کی تلخی اور برہنگی قاری کو محظوظ اور متاثر کرنے کے بجائے اکثر بے مزہ کردیتی ہے۔ اس لیے طنز کے تیر و نشتر کو گوارا بنانے کے لیے مزاح کی چاشنی ضروری ہے۔ دراصل یہی وہ موڑ ہے جہاں طنز و تضحیک کا پیرایہ تخلیقی ہنر کا درجہ حاصل کرلیتا ہے۔ فن کا تخئیل سے بھی کام لیتا ہے، خداداد ذہانت سے بھی اور زبان و بیان پر ماہرانہ قدرت سے بھی۔ اس کا مدعا یہی ہوتا ہے کہ افراد، اشیا یا ماحول کی جس بے تکی یا بے ہنگم کیفیت کا ردِّعمل وہ پیش کررہا ہے اس کی صداقت کو وہ مؤثر ترین انداز سے قارئین تک پہنچا سکے۔

اردو میں طنزیہ شاعری کی روایت سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ طنز کی ابتدا سب سے پہلے کہاں اور کیسے ہوئی، اور اسے مختصر طور پر یہاں قلمبند کرنا ضروری ہے تاکہ اس باب کو سمجھنے میں آسانی ہوجائے۔

طنز کی ابتدا کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا طنز نگار یونان کی سرزمین سے پیدا ہوا جو آرکی لوکس (Drchilochus) کے نام سے جانا گیا۔ محققین انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا لکھتے ہیں:

"In the accounts that have came down to us at the writings of Archilochus, the first great master of satire, are sum to trace the elevation of

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

instrument in public life."(1)

ترجمہ : ''آرکی لوکس کی تحریروں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ طنزنگاری کا امام تھا اور عوام میں اس کو مقبولیت حاصل تھی۔''

آرکی لوکس کے بعد ہپوناکس (Hipponox) اور سیمونائیڈس (Simoniades) نے بھی اس روایت کو اپنی شاعری میں برتا۔ ان کے بعد —

''اطالوی ادیبوں نے طنزیہ شاعری کی ابتدا کی جسے (Fecenine yerse) کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ شاعری اطالوی کسانوں کے جذبات کی نمائندہ تھی اور اس کے لیے انہی کی زبان کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ اس میں قدرت کی ستم ظریفیوں، بارش کے بروقت نہ ہونے اور حشرات الارض کی یلغار سے فصلوں کی تباہی پر قدرت کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔''(2)

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ طنز بھی انسان کی قدیم ساتھی ہے۔ آرکی لوکس 148 ق م کا طنزنگار ہے۔ اس سے طنز کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انسان کی ابتدائی زندگی اور آج کی زندگی کا فرق اسی دلیل کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جوش وخروش، جنوں، فہم و ادراک، جہد و خواہش کا قلب انسانی پر جس رفتار سے اثر ہوتا گیا اسی تناسب سے انسانی تاریک ماضی سے روشن مستقبل کی طرف قدم بڑھاتا گیا۔ قدرت کے پوشیدہ خزانوں سے کل تک وہ بے بہرہ تھا۔ آج بہرہ مند ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ ترقی کی راہ میں اس کا پہلا قدم ہے۔

اسی طرح دنیا کی ہر زبان میں اس کا ادب بتدریج ترقی کے مراحل طے کرتا جاتا ہے۔ سنجیدہ ادب کی طرح طنزیہ و مزاحیہ ادب کی تاریخ بھی مختلف ادوار پر مشتمل ہے۔ اس کے انداز اور اسالیب میں تبدیلیاں آئیں اور پھر انسان ایک ایسے نتیجہ پر پہنچا جسے مناسبت اور موزوں کہا جاسکتا ہے۔ ابتدا میں طنز کی جو صورت تھی وہ آج یقیناً ناپسند کی جائے گی۔ بارش کے نہ ہونے اور حشرات الارض کی فصلوں پر یلغار کی وجہ سے اس وقت انسان نے

1. Encylopaedia of Britannica, P. 5

2 احسن علی مرزا، کچھ طنز و مزاح کے بارے میں، ماہنامہ شب خون، الٰہ آباد، اپریل 1968، ص 67

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

قدرت پر طنز کی تھی۔ آج طنز کا مقصد خالصۃً اصلاح و درستگی ہے۔

اس خصوص میں انگریزی طنز و مزاح کی تاریخ اور اس کے ارتقا کا جائزہ ضروری ہے اس لیے کہ مغربی مفکرین کے حاصلِ فکر نے دنیا کی دیگر زبانوں کے ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ اردو زبان کا ادب فارسی اور انگریزی ادب سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن طنز کے میدان میں فارسی ادب کا اردو ادب پر بہت کم اثر ہے۔ اسی لیے کہا جاسکتا ہے کہ طنز و مزاح کے جو سانچے اور فن کے اعلیٰ نمونے اردو ادب میں ملتے ہیں وہ انگریزی ادبیات کی دین ہیں۔ لہٰذا یہ بھی ضروری بن جاتا ہے کہ ہم یہاں پر انگریزی ادب کے ان مفکرین اور طنزنگاروں کے نگارشات کو مختصراً قلمبند کریں جن کے جلائے ہوئے چراغوں سے آنے والی نسلوں نے اپنے چراغ روشن کیے۔

انگریزی طنزیہ ادب کا سنہری دور سترھویں صدی عیسوی میں جان ڈرائیڈن (John Dryden) کی سیاسی طنزیہ نظموں سے شروع ہوتا ہے۔ ڈرائیڈن اپنے عہد کا ملک الشعرا سمجھا جاتا ہے۔ اس کی پہلی سیاسی طنزیہ نظم (Abralom and Achitobhel) انگریزی ادب کی پہلی سیاسی نظم سمجھی جاتی ہے اور اسے انگریزی طنزیہ ادب میں بڑی اہمیت اور شہرت حاصل ہے۔ اس کے اسلوب کی ندرت انفرادیت اور جدّت نے نہ صرف عوام کو متاثر کیا بلکہ طنزیہ ادب کو ایک بلند مقام بھی عطا کیا چنانچہ اس کے بعد شہرت کے بام عروج پر پہنچنے والے طنزنگار سوئفٹ (Swift) اور پوپ (Pope) نے ڈرائیڈن ہی کے انداز اور اسلوب کو اپنی طنزیہ شاعری میں برتا، نتیجتاً طنزیہ شاعری عوام میں بے حد مقبول ہوئی اور لوگ اس کے پڑھنے کے لیے بے تابی کا مظاہرہ کرنے لگے۔

سوئفٹ (Swift) اور پوپ (Pope) نے انگریزی زبان کی طنزیہ شاعری کو ایک ایسا وقار بخشا جو بنیادی حیثیت کا حامل بن گیا۔ اور جب اردو میں طنزیہ شاعری کا آغاز ہوا تو یہی پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا جو ان دونوں (سوئفٹ اور پوپ) طنزنگاروں کا مخصوص پیرایہ اظہار تھا۔

دراصل کسی بھی ملک وقوم کی معاشی، معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی کے مطالعہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کے لیے اس ملک یا قوم کی نمائندہ زبان کے ادب کا تفصیلی مطالعہ بھی ضروری ہے اور پھر درست اور صحیح صحیح حالات کی آگاہی کے لیے تو طنزیہ و مزاحیہ ادب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ محض اس لیے بھی کہ طنز و مزاح نگار کا محبوب خیالی نہیں ہوتا۔ طنز و مزاح نگار مفروضات سے قطعی متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ تو سماج کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھتا ہے۔ اس طرح سماج کی ہر حرکت پر اس کی نظر بڑی گہری ہوتی ہے۔ طنز و مزاح نگار کی نظر سماج یا افراد کے ایسے پہلو پر پڑتی ہے جس پر مزاحیہ انداز میں طنز کرنا اس کا فرض ہوجاتا ہے۔ اس کے پیش نظر محض تفریح نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے آپ کو ایک مصلح (Reformer) کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

طنز و مزاح نگار کا جذبۂ ہمدردی اسے ایک مصلح کا درجہ عطا کرتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر وہ شخصیات کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بناتا ہے تو اس کی طنز یا مزاح ایک بے معنی بلکہ شکن حربہ بن جاتی ہے۔ محققین کی رائے میں سترھویں صدی عیسوی سے طنز و مزاح نے جو صورت اختیار کی وہ اس قدر موثر اور مفید تھی کہ طنز و مزاح نگار محض ہنسانے یا سامانِ تفریح مہیا کرنے والا انسان نہیں رہا بلکہ وہ مصلح نکتہ سنج ہوش اور ایک اعلیٰ مقرر کے صفات سے متصف ہوگیا۔ ایک بھرپور طنز جو مزاح کے پیرائے میں کی جائے، بگڑے ہوئے حالات کو معمول پر لانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوسکتی ہے۔

آزادی کے بعد ہمارے سیاسی اور سماجی حالات نے ایک ڈرامائی انداز میں یکسر پلٹا کھایا، اس قدر برق رفتاری سے تبدیلیاں رونما ہوئی کہ ایسا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا لیکن ان حالات کو زیر بحث لانے سے قبل ماضی کے دریچوں میں جھانکنا ضروری ہے تاکہ صحیح تقابل تک رسائی ہوسکے۔

دنیا کی دوسری زبانوں سے قطع نظر جب اردو کے قدیم اور ساتھ ہی جدید ادب پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی زبانوں میں بالخصوص اردو کو وہ درجہ یا خصوصیت حاصل ہے جس نے ملک و سماج کے واضح نقوش پیش کیے۔ مولانا حالی کے بقول:

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

''اردو زبان ہندوستان کی اور تمام زندہ زبانوں کی نسبت بالاتفاق زیادہ وسیع اور خیالات ادا کرنے کے زیادہ لائق ہے۔''(1)

اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال 1707ء کے بعد سے مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور پھر 1737ء میں نادرشاہ کے بہیمانہ حملے نے ہندوستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ وہ آسودگی، چین اور سکون جو ہندستانیوں کو اورنگ زیب کے دور حکومت تک ملتا رہا، یکسر ختم ہوگیا تھا۔عوام میں بے چینی، غربت اور مفلوک الحالی بڑھنے لگی کیونکہ اورنگ زیب کے انتقال اور نادرشاہ کے حملے تک تخت دہلی پر متعدد بادشاہ متمکن ہوئے لیکن ان میں سے کسی میں بھی ایسی صلاحیت نہیں تھی کہ سلطنت کے سابقہ وقار و شان کو برقرار رکھ سکتا چنانچہ پامالی اور انحطاط بہادرشاہ ظفر تک آتے آتے ہندوستان کی تقدیر بن گئی بلکہ یہاں آکر تو رہی سہی ساکھ بھی ختم ہوگئی۔عوام کے دلوں پر مایوسی اور نامرادی کے اثرات نے غلبہ کیا۔ رخساروں پر شباب کی سرخی کے بجائے سیدھی اور پژمردگی نمایاں ہوگئی۔ اس طرح جب اس دور کے شع و ادب پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اردو کی وہ خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے جو ملک وقوم اور سماج کے مزاجوں سے ہم آہنگ ہوکر اپنے آپ کو اپنے عہد کا نمائندہ ثابت کرتی ہے۔ لہٰذا جب اردو شاعری کا آغاز ہوا، معاشرہ میں ہر طرح کی ناہمواریاں بھی جنم لے رہی تھیں اور انسانی قدروں کا وہ استحکام اور نظام ٹوٹ رہا تھا جو سیاسی استحکام اور استقلال سے جڑا ہوتا ہے۔ اخلاقی سطح پر منفی قوتیں مثبت رویوں پر حکمراں تھیں۔ زندگی کے ہر شعبہ جات میں ہماہمی تصادم اور کشاکش کا دور دورہ تھا۔ معاشرہ انصاف اور اعتدال سے تقریباً عاری ہوتا جارہا تھا۔ یہ اٹھارہویں صدی کے آغاز کا زمانہ تھا جب میر جعفر زٹلی اپنی ہجوگوئی سے اردو زبان کو ایک نئے ذائقہ سے آشنا کررہے تھے۔ وہ نہ صرف ہجوگوئی بلکہ اردو شاعری میں شہر آشوبوں کی اس عظیم روایت کی داغ بیل ڈال رہے تھے جن کے وسیع آئینہ میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی سماجی ہلچل کا بھرپور مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

---

1 مولانا حالی، مقدمہ شعر و شاعری، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1983، ص 138

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

طنز و مزاح کا سراغ یوں تو جعفر زٹلی کے اردو فارسی کے ملے جلے طنزیہ و مزاحیہ اشعار سے لگایا جاسکتا ہے یا پھر ان درجنوں ''شہر آشوبوں'' سے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں معرضِ وجود میں آئے۔ عام طور پر زٹلی کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صرف ایک مسخرہ اور فحش گو تھے، لہٰذا اکثر اس کا ذکر اس ضمن میں آتا ہی نہیں ہے اور اگر آتا بھی ہے تو اس طرح ''اردو طنزیات میں'' (1) (جعفر زٹلی سے قطع نظر) سوداؔ کے علاوہ کوئی اور ہستی نظر نہیں آتی ہے'' یا ان سب میں جعفر زٹلی سب سے زیادہ مشہور ہے'' (2)

اس میں کوئی شک نہیں کہ جعفر زٹلی کے کلام کا بڑا حصہ فحش گوئی اور عریاں نگاری اور مبتذل شعروں پر مبنی ہے، لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ہر شاعر یا ادیب کو اس کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ جعفر زٹلی کا زمانہ وہ تھا جب شاعری کی باقاعدہ ابتداء بھی نہیں ہوئی تھی۔ سیاسی انحطاط کے ساتھ اخلاقی انحطاط بھی شروع ہو چکا تھا اور اس کی عکاسی جعفر زٹلی کے کلام سے بہت اچھی طرح ہوتی ہے۔ کسی شاعر کے یہاں اگر عریانی اور فحش گوئی کے عناصر زیادہ ہوں تو اسے بالکل نظر انداز کر دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا ہے اور جعفر زٹلی جیسے شاعر کو محض ایک مسخرہ اور فحش گو کہنا بھی اس پر ظلم ہے، کیونکہ طنز و مزاح کا معیار بہت کچھ تو اپنے زمانے کے سماجی تقاضوں اور اخلاقی معیار پر منحصر ہوتا ہے۔ اسی لیے ''ہر عہد میں طنز و مزاح کے ادبی پیکر اور سانچے بدلتے رہے ہیں۔ ضلع جگت، جلی کٹی، ہزل گوئی، پھبتی، تمسخر اور استہزا، چٹکلے بازی.....'' (3)

جعفر زٹلی کے کلام کی ایک تو یہ اہمیت ہے کہ ''جعفر کے کلام سے جتنا اس وقت کے سیاسی و اخلاقی معیار کا اندازہ ہوتا ہے، اتنا اور کسی شخص کے کلام سے نہیں ہو سکتا ہے'' (4)

---

1 رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامع نگر، دہلی)، ص 53

2 ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری (اتر پردیش اردو اکادمی، 1997ء چوتھا ایڈیشن)، ص 61

3 ڈاکٹر سیدہ جعفر، ''اردو نظم میں طنز و مزاح کے نئے رجحانات'' مشمولہ سالہ آجکل (ستمبر 2007ء)، ص 29

4 ڈاکٹر اعجاز حسین، اردو شاعری کا سماجی پس منظر، ص 166

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

جعفر زٹلی کے کلام میں مزاح سے زیادہ طنز کا عنصر نمایاں ہے وہ جو محسوس کرتا ہے کہتا ہے بلا کسی خوف و دہشت کے۔ فرخ سیر کے زمانے میں غلّے کی گرانی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ جعفر زٹلی نے زمانے کے دستور کے مطابق فرخ سیر کا سکّہ کہا تو اس پر یوں طنز کیا۔

سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ دانہ کش فرخ سیر

فرخ سیر اس کی تاب نہ لا سکا اور اسے قتل کر دیا۔[1]

جعفر زٹلی نے جابجا اپنے کلام میں اس دور کی سیاست اور سماجی حالات کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ایک جگہ نوکری کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے:

ہر صبح ڈھونڈھے چاکری کوئی نہ پوچھے بات رے
سب قوم ڈھونڈھیں لاگ ری یہ نوکری کا خط ہے
ہر روز مجرا اُٹھ کریں درکار یکسو گر پڑیں
بے شرم ایسے لڑ پڑیں یہ نوکری کا خط ہے
دس بیس مجرے میں گئے دس بیس منشی کو دیے
دس بیس میں جھگڑے کیے یہ نوکری کا خط ہے
دربار دیکھا خان کا بیڑا نہ پایا پان کا
ٹکڑا نہ پایا نان کا یہ نوکری کا خط ہے
صد پارہ دستارِ کہن نا پشت ماندہ پیرہن
تا آنکھ خستہ شد بدن یہ نوکری کا خط ہے

جعفر زٹلی نے اپنے دور کی سیاست اور سماج پر نشتر زنی کی ہے۔ ساتھ ہی اس دور کی اخلاقی پستی، معاشی بد حالی اور سیاسی ابتری کا ذکر طنزیہ انداز میں کیا ہے۔ وہ اپنی نظم ''دستور العمل در اختلاف زمانہ نا ہنجار گوید'' جو ایک طرح سے شہر آشوب کے زیل میں آتی ہے، میں اپنے دور کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

1 ڈاکٹر اعجاز حسین، اردو شاعری کا سماجی پس منظر، ص 149

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈری سب خلق عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹ میں کھوٹی
اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے
سپاہی حق نہیں پاویں نت اوٹھ چوکیاں جائیں
قرض بنیوں سے لے کھائیں عجب یہ دور آیا ہے

ان اشعار سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جعفر زٹلی کے کلام کا اسلوب ہی مضحک نہیں ہے بلکہ اس نے اپنے دور کی سیاست اور سماج پر بھی نشتر زنی کی ہے۔ انھوں نے بہت اچھے انداز میں اردو اور فارسی ترکیبوں کی آمیزش کی ہے اور باوجود اس کے کہ ان کے کلام میں رکیک اور مبتذل بلکہ عریاں اشعار کی زیادتی ہے لیکن یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ جعفر کے کلام میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں طنز و مزاح کے نقوش چاہے وہ دھندلے ہی کیوں نہ ہوں، نظر ضرور آتے ہیں۔

''ان کا کلیات اگر چہ فحش سے بھرا پڑا ہے پھر بھی انواع و اقسام کی ظرافت اس میں ملتی ہے''(1)

ہجو کا رواج امیر خسرو کے عہد سے چلا آرہا ہے۔ انھوں نے اس کی بنیاد ہجو ملیح یعنی ایسی ہجو پر رکھی ہے کہ ایک نظر میں مدح کا پہلو ہو مگر اس میں ''ذم'' کا پہلو بھی ہو۔ ابتداء سے متوسطین کے دور تک تقریباً سبھی شاعروں نے ہجویں لکھیں ہیں۔ اس میں طنز و مزاح کے عناصر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ہجویات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو شاعر اپنی ذات کے تحفظ اور اپنی برتری کے احساس کو قائم رکھنے کے لیے شخصی سطح پر طعن و تشنیع کے عمل میں مبتلا ہوکر لکھتا ہے اور دوسری وہ جن میں غیر شخصی سطح پر زمانے کے زوال آمادہ رجحانات اور شکست و ریخت کے عمل کو طنز کا نشانہ بناتا ہے۔

ہجو کی آخر الذکر قسم میں کہیں کہیں مزاح کے اور عام طور پر طنز کے اچھے نمونے ملتے

---

1 قاضی ظہور الحسن سیو ہاروی، ''تاریخ ہجو گوئی''، مشمولہ نقوش (جون 2006ء)، ص 97

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہیں۔ باوجود اس کے دور متوسط تک سبھی شاعروں نے کم و بیش اس صنف کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ جیسے جعفر زٹلی، آبرو، میر، حاتم، رنگین وغیرہ مگر ہجویات کے بادشاہ بلا شبہ سودا ہیں اور اس کو زیادہ تر نقادانِ ادب نے تسلیم کیا ہے۔

سودا کے سامنے ہجو کا وسیع میدان تھا اور انھیں زبان و بیان پر قدرت کاملہ حاصل تھی، لہٰذا انھوں نے جہاں قصیدے لکھ کر انوری و خاقانی جیسے شعراء کا درجہ کمال حاصل کیا، وہیں فارسی کے ہجو گو شاعر کے نمونے کی ہجویات بھی لکھی ہیں۔ انھوں نے اکثر شخصیات ہی کو موردِ طعن بنایا ہے لیکن ان کی بعض ہجو یہ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں اس عہد کی سماجی ابتری اور نظام زندگی کی ناہمواری کا احساس ہوتا ہے۔ قصیدہ 'تضحیک روزگار'، 'ہجو شیدی فولاد خان کوتوال' یا قصیدہ 'شہر آشوب' سے یہ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ ان سے ہم یہ ضرور سمجھ سکتے ہیں کہ سیاسی اور سماجی مسائل پر طنز کرنے کی جو ابتدا جعفر زٹلی نے کی تھی، سودا نے اسے بہت آگے بڑھایا۔ (1)

جعفر زٹلی سے لے کر آج اکیسویں صدی میں بھی، سیاسی کشمکش، اقربا پروری، رشوت ستانی اور بدانتظامی جاری و ساری ہے۔ اخلاقی سماجی اور مذہبی قدریں اس وقت بھی پامال کی جارہی تھیں اور آج بھی کی جارہی ہیں۔ جعفر زٹلی نے بھی اپنے زمانے میں طنزیہ انداز میں ان ساری برائیوں پر پردہ اٹھانے کی کوشش کی اور سودا نے بھی اپنے وقت کی ان ساری برائیوں اور کوتاہیوں کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور ان پر ہجو کہی۔ ان حقائق کے پیش نظر ہم سودا کو ادب عالیہ کے عظیم شعراء کے ساتھ شمار کرتے ہیں۔ (2)

ایک ہجو نگار اخلاقی قدروں کا پرستار ہوتا ہے، وہ اپنے دور کی ناانصافی ریاکاری، کو بڑ پن، بدنما مناظر، سیاسی رہنماؤں کی گمراہیوں اور مذہبی پیشواؤں کے تعصب اور ریاکاریوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ کبھی ان پر ہنستا ہے اور کبھی طنز کے نشتر چلاتا ہے تاکہ ان

---

1 ڈاکٹر طاہر تونسوی، طنز و مزاح۔ تاریخ و تنقید، ص 122

2 ڈاکٹر تاج بیامی، مزاحیہ شاعری اور چند مزاحیہ شعراء (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2007ء)، ص 49

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

خامیوں کو دور کیا جا سکے۔ سوداؔ نے بھی ایسا ہی کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ سوداؔ نے ہجو نگاری سے ہی کام لیا ہے حالانکہ سوداؔ کے ان ہجو یہ نظموں میں طنزیہ انداز ملتا ہے۔ کبھی معاشرے کی بدحالی، کبھی اخلاقی برائیوں کو اُجاگر کیا ہے تو کبھی اپنے دشمنوں سے انتقام لیا ہے۔

اس بات سے انکار بھی ممکن نہیں کہ سوداؔ اردو کے پہلے طنز نگار شاعر ہیں لیکن اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے یہاں تمسخر زیادہ اور طنز کم ہے۔ سوداؔ کی طنزیہ شاعری کا تمام تر سرمایہ ان کا مجموعہ کلام ہے۔ ویسے ہجو بھی طنز ہی ہے لیکن ہجو اور طنز میں ایک بنیادی فرق بھی ہے۔ طنز صلاح و اصلاح ہے اور ہجو جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا ہے۔ سوداؔ کے ہجویات بھی اسی رنگ میں ہیں۔ ان میں استہزا، تمسخر، مضحکہ، پھکڑ پن، گالی گلوچ سبھی کچھ ہے۔ ان میں سوداؔ نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ ان کا مقصد اصلاح نہیں اسی لیے ان کو طنز نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں کسی کو رسوا کرنے کا جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن سوداؔ کی ہجویات دو طرح کی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جن میں کسی فرد واحد مثلاً فاخرؔ، مکینؔ، یا میر ضاحکؔ کی خبر لی گئی ہے۔ یہ تمسخر کی حد میں آتی ہیں۔ چند ایسی بھی ہیں جن میں شکایت روزگار یا اہلِ روزگار ہے یا جن میں پورے معاشرے یا اس کے کسی طبقے کو ہدف مطاعن بنایا گیا ہے۔ ان میں طنز ہے اور بڑا گہرا اور شوخ قسم کا اور شاید سودا کو اسی کلام کی وجہ سے اس کو اردو کے طنز نگار شعراء میں شمار کیا گیا ہے۔[1]

لیکن سوداؔ فطرتاً ہنسوڑ تھے۔ ان کے یہاں ہنسنے کی اہمیت زیادہ ہے۔ ان کے فن کی روح ٹھٹھول ہے۔ طنز کے لیے جذبے کی جس شدت اور نظر کی جس دقت کی ضرورت ہے وہ اس سے محروم ہے۔ سوداؔ کے قصیدوں کی طرح ان کی ہجویات بھی مانگے کی ہیں۔ ان میں جدت یا تازگی نہیں۔ سوداؔ مضمون پیدا کرنا خوب جانتے تھے۔ ان کی ہجویات بے بات کی بات سہی لیکن ان میں فکر و شعور بیدار کرنے والی کیفیت نہیں، لیکن ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کے یہ فقرے بھی قابلِ غور ہیں:

---

1 شوکت سبزواری، ''اردو شاعری میں طنز'' مشمولہ طنز و مزاح۔ تاریخ و تنقید از ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص 101

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

''سوداؔ کی شخصی ہجویات میں بھی سماجی حالات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ انھوں نے کسی پر قہقہہ بھی لگایا تو اس میں بھی نظام معاشرت کے اثرات پوری طرح کارفرما نظر آتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہجویات اور مزاح کے محرک ان کے وقت کے سماجی حالات ہیں''(1)

البتہ سوداؔ کی وہ ہجویات جن کا انداز عمومی یا جن کی اہمیت سماجی ہے، کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں اور دراصل سوداؔ کی یہی ہجویات پائیدار عناصر کی حامل بھی ہیں۔ ان ہجویات میں معاملات کو مبالغہ کے ساتھ پیش کرکے زندگی کی ناہمواریوں کو نشانۂ تمسخر بنایا گیا ہے اور اگرچہ مبالغہ آرائی نہایت مشکل چیز ہے اور اس میں توازن کی کمی خود مبالغہ کرنے والے کو نشانۂ تمسخر بنا دیتی ہے۔ لیکن ان ہجویات میں سوداؔ نے کچھ ایسے نکھرے ہوئے اور جچے تلے انداز میں مبالغہ آرائی کی ہے کہ یہی چیز ان تخلیقات کا حسن بن گئی ہے۔ اس سلسلے میں سوداؔ کا قصیدہ ''شہر آشوب'' جس میں انھوں نے سماجی حالات کو نشانۂ تمسخر بنایا ہے، کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شاعر جو سنے جاتے ہیں مضمحل الاحوال
دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر
گر رحم میں بیگم کے سنے نطفۂ خان ہے
اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

''شہر آشوب''

ہجویات کے اس ضمن میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مرزا سوداؔ فارسی ہجویات سے بے حد متاثر تھے اور تو اور گھوڑے کی ہجو (جو ان کی ہجویات میں امتیازی مقام رکھتی ہے) کا تصور ہی فارسی سے مستعار ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے گھوڑے

1 ڈاکٹر عبادت بریلوی، ہماری مزاح نگاری (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2001ء)، ص 88

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کی یہ ہجو لکھ کر فارسی ہجو کی پوری طرح تقلید کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں سودا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ناطاقتی کا اس سے کہاں تک کروں بیان
فاقوں کا اب میں اس کے کہاں تک کروں شمار
مانندِ نقشِ نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
ہر رات اخترؤں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بے قرار
ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے
میخیں گر اس کے تھان کی ہوویں نہ استوار
ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ لے کے ریگ بیاباں کرے شمار
مانند اسپ خانۂ شطرنج اس کے پاؤں
جزو ست غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار

ان اشعار میں صرف دو باتیں کہی گئی ہیں۔ گھوڑے کی فاقہ کشی اور لاغری، ان میں مبالغہ ہے مگر اس مبالغہ آرائی میں بھی شاعرانہ حسن بدرجہ اتم موجود ہے اور ان ہجویات کا جہاں تک تعلق ہے جو انھوں نے معاشرے کی بد حالی، ابتری اور اخلاقی انحطاط پر لکھی ہیں، یا جن میں انھوں نے حکومت کی بدعنوانیوں اور سیاست پر طنز کیا ہے وہ یقیناً قابلِ قدر ہیں اور اس ضمن میں اہمیت کی حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر نقادانِ ادب نے سوداؔ کو ہجویات کا بادشاہ تسلیم کیا ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی:

"سوداؔ کو اردو ہجو میں نہ صرف تقدم حاصل ہے، بلکہ ان کے کلام سے طنزیات کی بہترین صلاحیت و استعداد بھی نمایاں ہیں"(1)

---

1 رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات (مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامع نگر، دہلی)، ص 54

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، سوداؔ کی ہجویات کی خامیوں کو گنانے کے بعد اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بے دھڑک طنز و ظرافت کا مادہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھا'' (1)

ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں:

''سوداؔ کی وہ ہجویات جن میں اس نے فوجی نظام کے انحطاط پر طنز کیا ہے یقیناً طنزیہ شاعری کے اعتبار سے قابل قدر ہیں'' (2)

شیخ چاند، سوداؔ کی ہجویات کے بارے میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

''شوخی اور زندہ دلی اس کی طبیعت میں اس درجہ تھی کہ جہاں کہیں موقع ملتا ہے وہ بے اختیار ظریفانہ انداز میں اس کا اظہار کر دیتا ہے'' (3)

''سوداؔ نے برجستہ الفاظ و محاورات کے استعمال سے اپنی ہجویات میں جان ڈال دی ہے'' (4)

اردو طنزیہ شاعری کی روایات کے سلسلے میں میر جعفر زٹلی اور سوداؔ کے ساتھ ساتھ میرؔ کی ہجویات کا ذکر بھی ضروری ہے اور اگرچہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہجو کے میدان میں سوداؔ کو میرؔ پر سبقت حاصل ہے تاہم میرؔ کی وہ ہجویات نظر انداز نہیں کی جاسکتی جن میں میرؔ نے ذاتیات کے جھگڑوں میں الجھنے کے بجائے اپنے ماحول کو ہجو کا نشانہ بنایا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنے گھر کا جس انداز سے مضحکہ اڑایا ہے اور جس طریق سے اس کی جزئیات پر غائر نظر ڈالی ہے وہ بے حد قابلِ ستائش ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ ''گھر'' کی یہ ہجو میرؔ کے رنگِ طبیعت کے عین مطابق ہے لہٰذا یہاں وہ اپنی شاعری کے مقامِ بلند پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ میرؔ دراصل نہاں خانہ دل کے شاعر ہیں اور اپنے اشعار میں ماحول

---

1 پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، مسائل و مباحث، ص 180

2 ڈاکٹر وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج (نریندر ناتھ سوز، نئی دہلی، 2000ء)، ص 384

3 شیخ چاند، سوداؔ، ص 45

4 شیخ چاند، سوداؔ، ص 281-280

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کی عکاسی کے بجائے داخلی طریق کار اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اپنے ''گھر'' میں ایک لحظ کے لیے جھانکتے ہیں تو دراصل اپنے نہاں خانہ دل میں جھانک رہے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دل کے انتشار اور بے قراری کی طرح ''گھر'' کی ابتری اور بے ترتیبی بھی ان کے لیے دلچسپی کا موجب ہے اور یہاں ان کے قلم میں وہی روانی پیدا ہوجاتی ہے جو ان کی غزلیات کا طغرائے امتیاز ہے۔ علاوہ ازیں ''گھر'' کی ان ہجویات کے مطالعے سے میرؔ کی وسیع القلبی کا بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ خود کو نشانۂ تمسخر بنانے سے بھی گریز نہیں کرتے ''مثنوی در ہجو خانہ خود'' سے میرؔ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا لکھوں میرؔ اپنے گھر کا حال
اس خرابے میں میں ہوا پامال
گھر! کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے
سخت دل تنگ یوسف جاں ہے
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق
سو شکستہ ترا ز دلِ عاشق
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک
کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک
کہیں گھر ہے کسی چھچھوندر کا
شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے
کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے
شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں
ساتھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے
ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر
ایک انگوٹھا دکھاوے انگلی پر

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

گرچہ بتوں کو میں مسل مارا
پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

مندرجہ بالا اشعار میں میرؔ نے اپنے گھر کا نقشہ کھینچا ہے لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کہ انھوں نے سوداؔ کی طرح شہر آشوب لکھ کر طنزیہ انداز میں اپنے زمانے کی حالات کی عکاسی کی ہے مثلاً انھوں نے اپنے شہر آشوب میں نوابوں اور امیروں کے دربار کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

مشکل اپنی ہوتی ہے بود و باش آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
اُن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش ہے لب ناں پہ سو جگر پرخاش
نے دمِ آب ہے نہ چمچۂ آش
زندگی ہوتی ہے سب پر وبال کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال ایک تلوار بیچ ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

شہر آشوب کا مطالعہ اگر غور سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں طنز کا عنصر بھی برائے نام ہے، زیادہ تر شہر آشوبوں میں شاعروں نے اپنے دور کی ابتری اور بدحالی کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ وہ اپنے دور کے مرثیے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا اطلاق خاص طور سے ان شہر آشوبوں پر ہوتا ہے جو 1857ء کے لکھے گئے، جن میں غم و مایوسی کی لے نمایاں ہے۔ اس میں دہلی کے اُجڑنے کا ماتم ہے ایک تہذیب وتمدن کے لٹنے کا غم ہے اور دنیا کی ناپائیداری کا گلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ کی ہجو میں وہ بات پیدا نہیں ہوسکی جو دل کی گہرائیوں تک اُتر سکے۔ لیکن اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ بحیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو ہجو اس دور میں ایک نمایاں روش کی حیثیت رکھتی ہے اور ہمیں بقول رام بابو سکسینہ:

''سوداؔ اور میرؔ کے علاوہ اور بھی بہت سے اردو شعراء اس کی طرف مائل نظر آتے ہیں چنانچہ دلی میں بقاء اللہ بقاؔ نے میرؔ و مرزاؔ کی ہجویں لکھیں۔ لکھنؤ میں میر حسنؔ نے عظیم۔ قصاب اور مکان بڑی مہذب اور پر لطف ہجویں تحریر

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کیں اور انشا، مصحفی اور ان کے ہم عصر شعراء نے ایک دوسرے کو ہجو کا نشانہ بنایا۔ بعد ازاں جب آہستہ آہستہ فارسی کے اثرات کم ہوئے اور اردو ادب کے دھارے نے ایک نئی سمت اختیار کی تو ہجویات کا طوفان بھی تھم گیا اور فضا میں اعتدال اور اغماض و درگزر کی لہریں دوڑنے لگیں''(1)

ہجویات کا طوفان تھم جانے کے بعد سب سے پہلے ہماری نظر نظیر اکبر آبادی پر پڑتی ہے۔ بے شک سودا کے بعد اردو کے دوسرے طنز نگار شاعر نظیر اکبر آبادی ہی ہیں، جن کا نام ہمارے تذکرہ نگاروں نے شعراء کی فہرست ہی سے خارج کر دیا تھا، شاید وہ اس بات سے نا آشنا تھا کہ نظیر وہ شاعر ہیں جس نے عوام میں شامل ہو کر نہ صرف عوامی زبان میں گفتگو کی بلکہ عوام کو جینے کے لیے مختلف پہلوؤں سے عکاسی بھی کی ہے۔ بقول نیاز فتح پوری:

''نظیر چٹکلے باز تھے۔ دل کی لگی سے زیادہ دل لگی ان کا شیوہ تھا''

نظیر اکبر آبادی اردو کے شاید تنہا عوامی شاعر ہیں جو مقامی بھی ہیں۔ انھیں ہنس ہنس کر وار کرنا خوب آتا ہے۔ نظیر کے یہاں طنز و ظرافت کا بڑا اچھا امتزاج ہے، اچھا اس لیے کہ اس میں تیز قسم کا طنز اور ہلکی پھلکی ظرافت صرف کی گئی ہے۔ اس کا مزاج بڑا ہی خوشگوار ہے۔ شگفتگی میں تلخی کی ایسی آمیزش جو مذاق صحیح کو ناگوار نہ ہو، بڑے سلیقے کا کام ہے۔ نظیر میں یہ سلیقہ تھا اور اس کو ایک ماہر فنکار کی طرح اس نے برتا ہے۔ ''آدمی نامہ'' نظیر کی مشہور نظم ہے، یہ تقابلی طنز کی بہترین مثال ہے۔ اردو تو کیا شاید دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بھی مشکل ہی سے اس کے ہم پایہ کوئی نظم پیش کی جا سکے۔ سودا کے طنز کی دنیا جتنی تنگ اور محدود تھی۔ نظیر کی اتنی ہی وسیع اور لامحدود ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ نظیر اکبر آبادی نے اپنی نظموں میں جو اسلوب اختیار کیا اس سے ظرافت اور مزاح کا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ''آدمی نامہ'' ایک سنجیدہ نظم ہے جس میں شاعر آدمی کی حیثیت کرتا ہے۔ آدمی کی حیثیت سے ہر آدمی ایک ہے لیکن اس نے

---

1 رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو ترجمہ عسکری، ص 209

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

خودکو شاہ و گدا سرمایہ دار و مزدور ''رہبر و رہزن'' گورے اور کالے میں بانٹ رکھا ہے:

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

''سو ہے وہ بھی آدمی'' کا ٹکڑا بڑا ظریفانہ لگتا ہے اور پھر ان کی ایک اور نظم ''روٹی نامہ'' کا یہ بند:

پوچھا کس نے یہ کس کاملِ فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کس لیے
وہ بولا سن کے بابا خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھتے نہ سورج ہی جانتے
بابا ہمیں تو سب نظر آتی ہیں روٹیاں

ان مزاحیہ مصرعوں میں طنز کا جو چٹیلا پن ہے وہ محسوس کرنے کی چیز ہے۔ سوداؔ کا بھوکا گھوڑا ستاروں کو دانا سمجھتا ہے اور نظیرؔ کا کاملِ فقیر چاند سورج کو روٹیاں سمجھتا ہے۔ کتنا کرب ہے اس میں۔ نظیرؔ اکبر آبادی نے طنز و مزاح کو ایک معیار بخشا۔ یہ ان کا کمال ہے۔ نظیر بھی صوفی صفت شاعر تھے۔ وہ ہندو مسلم دونوں سے محبت رکھتے تھے اور دونوں کے جذبات و احساسات کا احترام کرتے۔ ان کے تہوار خوشی اور غم میں شریک ہوتے۔ وہ کثرت میں وحدت کے قائل تھے۔[1]

نظیرؔ اردو کے وہ پہلے شاعر تھے جنھوں نے نہ صرف شعر کو اپنے ملک کے جیتے جاگتے ماحول سے قریب تر لانے کی سعی کی بلکہ جو وسیع ہجو کی محدود کینہ پروری سے نکل کر

---

1 ڈاکٹر تاج بیامی، مزاحیہ شاعری اور چند مزاحیہ شعراء (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2007ء)، ص 45

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

طنز و مزاح کے وسیع اطلاق کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ اس میں کوئی کلام بھی نہیں کہ نظیر باقاعدہ طور پر طنز نگار کی حیثیت سے نہ ابھرے لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انھوں نے زندگی کو ایسے نئے نئے زاویوں سے دیکھا کہ ان کے بہت سے اشعار میں طنز و مزاح کے نقوش از خود ابھرتے چلے آئے جس کی وجہ سے انھوں نے طنز نگار شعراء کی صف میں اپنی جگہ بنالی۔

نظیر کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کو ایک اور لحاظ سے بھی اہمیت حاصل ہے۔ وہ یہ کہ نظیر نے اردو شاعری کی اس ابتدائی دور ہی میں مزاح اور طنز کا ایک ایسا معیار قائم کیا جو مغربی ادب سے متاثر ہوئے بغیر اس کے جدید تصور سے بہت قریب تھے۔ نظیر کے یہاں طنز کی نشتریت بھی موجود ہے۔ ان کی نظر معاشرے کی ایسی ناہمواریوں تک جا پہنچتی ہے جو بالعموم ایک عام انسان کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ ایسے موقعوں پر نظیر کے لہجے میں طنز کا رنگ بھی چھلکنے لگتا ہے جس کی عمدہ مثال نظیر کی نظم ''آدمی نامہ'' کا یہ بند ہے:

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی نماز اور قرآن یہاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

طنز سے قطع نظر نظیر اکبر آبادی کے مزاح کی نمایاں خصوصیت وہ ہمدردانہ اندازِ نظر ہے جو قریب قریب ان کی تمام شاعری میں موجود ہے اور جس کے زیر اثر وہ اپنے نشانہ تمسخر کو حقارت کی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ اس لحاظ سے بھی وہ مزاح کے جدید تصور سے زیادہ قریب ہیں۔ نظیر ان چیزوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں جنکا تعلق ہماری روزانہ زندگی سے ہے۔ ان کی نظم 'روٹی نامہ' ایک طرف حقیقت نگاری کی اچھی مثال ہے، دوسری طرف طنز کا اچھا نمونہ بھی۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ نظیر کے طنز کی یہ اہمیت ہے کہ ان کے طنز میں زہر ناکی نہیں، ہمدردی کا عنصر ہے۔ ''وہ اپنے نشانہ تمسخر کو حقارت سے نہیں

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

دیکھتے"[1] اسی لیے ان کی طنز کامیاب ہے اور اس طرح وہ "مزاح کے جدید تصور سے قریب ہیں"۔

لیکن اردو شاعری میں جس شاعر کے یہاں طنز ومزاح کے واضح نقوش اور اعلیٰ نمونے ملتے ہیں وہ ہیں مرزا غالبؔ وہ کبھی اپنی فاقہ مستی کا مذاق اڑاتے نظر آتے ہیں، کبھی واعظ کی پارسائی کا، کبھی جنت کی حقیقت پر طنز کرتے ہیں، کبھی خدا کی خدائی پر، کبھی فرشتوں کے لکھے پر پکڑے جانے پر احتجاج کرتے ہیں، کبھی عذاب وثواب اور عقائد پر چوٹیں کرتے ہیں۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

غالبؔ کے اندازِ بیان میں جو انفرادیت کا جوش وخروش ہے وہ ان کی ظرافت ہے۔ یہ سچ نہیں کہ حالیؔ نے غالبؔ کو حیوانِ ظریف کہا ہے بلکہ خود غالبؔ نے اپنے تعارف میں خود کو ظریف کہا ہے جیسے:

شاعرم منشی ام ظریف و شریف
ایں اضافات چند را میرم
سینہ صافم قلندرم مستم
راز خود را نہاں نمی خواہم

اگرچہ غالبؔ کے کئی مزاحیہ اور طنزیہ اشعار شعر خوب کے زمرے میں آتے ہیں اور بقول بیدلؔ 'شعر خوب معنی ندارد' یعنی شعر خوب کے سطحی معنی نہیں ہوتے۔ فارسی اور اردو میں 'بوسہ' ایک پرانا گھسا پٹا مضمون ہے، لیکن جب غالبؔ اسی موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں تو

---

1 وزیر آغا، اردو ادب میں طنز ومزاح (ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2007ء ترمیم شدہ ایڈیشن)،

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اس میں کمال ظرافت کے جوہر دکھاتے ہیں:

من بہ وفا مردم رقیب ام در ذو
نیم لبش آنگبیں نیمہ تبرذو

یعنی میرے معشوق کا آدھا ہونٹ شہد کا ہے اور آدھا مصری سے بنا ہوا ہے، میں وفا کر کے مرگیا اور میرا رقیب مزالے کر نکل گیا۔

ہست تفاوت بسی، ہم زر طب تا نبید
لذت دیگر دہد بوسہ جو دشنام شد

(فرق ہے کھجور اور اس کی تلخ شراب نبید کے اثر میں، بوسہ جو گالیوں کے ساتھ حاصل ہوا اس کا مزہ ہی کچھ اور ہے)[1]

مرزا غالبؔ کی طنز کا ہجو سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے کبھی کسی کی ہجو سے اپنی زبان آلودہ نہیں کی۔ اس لحاظ سے وہ سوداؔ اور انشاؔ کے سلسلے میں نہیں آتے۔ غالبؔ کے طنز و ظرافت کی بنیاد نظر وخبر اور بصیرت و بصر پر ہے۔ غالب کے یہاں سلیقہ بڑی چیز ہے اور یہی ان کے فن کی جان ہے۔ ان کے فن کا یہ سلسلہ ان کے فکر کی روشنی سے ہے۔ غالبؔ کے طنز کی کئی خصوصیات ہیں۔ ایک تو بقول رشید احمد صدیقیؔ:

''وہ براہ راست نہیں، اشاروں اشاروں میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ جس پر وہ وار کرتے ہیں اسے اول تو اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ان کے طنز کا نشانہ تھا اور اگر ہوتا ہے تو اس وقت جب طنز اپنا اثر کر چکا ہے''۔

غالبؔ کے طنز میں شوخی کا رنگ ہے اور اس لحاظ سے وہ سوداؔ اور نظیرؔ کے طنز سے مختلف ہے۔ غالبؔ کا عقیدۂ طنز کے بارے میں یہ ہے کہ وہ جتنا خم دار ہو، اچھا ہے۔ ویسے بھی رسم پرستی سے انھیں ہمیشہ نفرت رہی اور پامال راہوں پر چلنا انھوں نے کبھی پسند نہیں کیا، لیکن ان کا طنز بالکل ان کی اپنی چیز ہے اور اس میں انفرادیت بہت زیادہ

---

1 ماہنامہ بزم سہارا مئی 2010ء، ڈاکٹر سید تقی عابدی کا مضمون، ''حکیم طنز و مزاح۔ سید محمد جعفری''

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہے۔(1)

مرزا غالبؔ کا طنز نرم ہی نہیں ہموار بھی ہے اور اس کی ہمواری یہ ہے کہ اکبرؔ الٰہ آبادی کی طرح لفظوں کی الٹ پھیر یا بقول آل احمد سرور:

''محاورات کی قوس وقزح کی سی رنگینی سے یہ پیدا نہیں ہوا بلکہ روح کی طرح شعر کی نس نس میں ساری ہے''

غالبؔ کا فن شوخی کا فن ہے ءپھبتی اور چٹکلہ بازی کا فن نہیں۔ اس خصوصیت میں غالبؔ، اکبرؔ الٰہ آبادی سے بھی ممتاز ہیں اور نظیرؔ اکبرآبادی سے بھی۔ اکبرؔ پھبتی اچھی کہتے ہیں اور نظیرؔ کے یہاں چٹکلے خوب ہوتے ہیں۔ غالبؔ شوخ نگار ہیں اور اس کی شوخی کی جان طنز ہے۔ اس کا اندازہ ان اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

اس شعر میں کتنا پاکیزہ، گہرا اور مؤثر طنز ہے اور اس کو جس سادہ و پرکار انداز میں ادا کیا گیا ہے، اس کا لطف محسوس کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

غالبؔ کا طنز ایمائی ہے اور اس میں زور، اثر، تازگی، لطف جو کچھ بھی ہے ایما کی وجہ سے ہے۔ ایما اور شوخی غالبؔ کے طنز کی دو بڑی خصوصیتیں ہیں۔ ایک میں وقت اور گہرائی ہے، دوسرے میں رنگینی اور گہرائی۔ غالبؔ کے موضوعات میں اتنا تنوع نہیں جتنا اکبر کے موضوعات میں ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ غالب کا طنز تنگنائے غزل میں صرف ہوا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

جو پہلے سے جذباتِ محبت اور اس کی سرشارانہ کیفیتوں کے لیے مخصوص ہو چکی تھی۔ ادھر اس کے فن میں جو ایک طرح کی نازکی اور رعنائی ہے اس کا تقاضا تھا کہ اس میں اجتماعی زندگی کی ہنگامہ آرائیاں راہ نہ پائیں اور اس کو زندگی کے بڑے اور ابدی مسئلوں کے لیے وقف رکھا جائے۔ غالبؔ کے طنز کی ابدیت فن و فکر اور ہیئت و موضوع دونوں کی وجہ سے ہے، انسان، خدا، مذہب، عبادت، جنت اور اس کی نعمتیں، فکر و خیال کی پابندی جیسے اہم مسئلے غالب کے طنز کا موضوع ہیں جن پر اس بڑے فنکار نے اپنا زورِ بیان صَرف کیا۔

بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے طنز کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ:

''ایمائی ہے اور اس میں زور اثر تازگی جو کچھ بھی ہے ایما کی وجہ سے ہے۔''(1)

مرزا غالبؔ کے طنزیہ انداز کی کامیابی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ آج ہمارے نکتہ رس نقاد بھی اس چھپے ہوئے طنز کا پتہ نہ لگا سکے۔ غالبؔ کے کلام میں طنز و مزاح کا جائزہ لینے کے بعد ہمیں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی اس رائے سے متفق ہونا پڑتا ہے کہ:

''غالبؔ سے پہلے اردو میں پھکڑ پن، مسخرگی، ہجو وغیرہ کے نمونے تو ملتے ہیں لیکن اعلیٰ ظرافت کے نمونے غالب کا کارنامہ ہیں۔''(2)

غالبؔ کا انتقال 1869ء میں ہوا۔ اس کے پورے آٹھ سال بعد 1877ء میں لکھنؤ سے منشی سجاد حسین کی ادارت میں اخبار ''اودھ پنچ'' کا اجرا ہوا اور طنز و مزاح کا ایک نیا باب کھل گیا۔ اس اخبار کے اجرا سے طنز و مزاح کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ اس وقت طنز و مزاح کا سب سے بڑا محرک اس وقت کی ملکی سیاست اور سماجی فضا تھی۔ معاشرے میں انتشار کی کیفیت تھی۔ غیر ملکی حکومت اور تہذیب کا تسلط ہو رہا تھا۔ لوگوں کے رویوں میں

---

1 شوکت سبزواری، ''اردو شاعری میں طنز'' مشمولہ طنز و مزاح۔ تاریخ و تنقید از ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص 91

2 رشید احمد صدیقی، ''کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا، مشمولہ نقد غالب، ص 36

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

بے اعتدالی اور بے یقینی تھی اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے ادب پر مغربی ادب کے اثرات پڑنے شروع ہوگئے تھے۔ یہ دور جیسا کہ اس اخبار کے نام سے ظاہر ہے کہ اردو ادب پر انگریزی اثرات کے آغاز اور اسی مقام سے ہماری شاعری میں طنز و مزاح کے نقوش نمایاں طور پر ابھرے اور اپنی مختلف کیفیتوں میں فضا پر اثر انداز ہوتے نظر آتے ہیں۔ ویسے بھی یہ حقیقت ہے کہ ''اودھ پنچ'' نے جس زمانے میں آنکھ کھولی وہ اس کے نمو و ارتقاء کے لیے مناسب ترین وقت تھا۔ ہمارے سماجی، مذہبی، معاشی اور سیاسی زندگی میں یکا یک ایک ایسا جذباتی اندازِ نظر کارفرما ہوگیا تھا جس سے ذہنی توازن کا یکسر فنا ہوجانا غیر اغلب نہیں تھا۔ چنانچہ ضروری تھا کہ کوئی ایسا باہمت شخص یا ادارہ منظر عام پر آئے جو قدم کے اس طوفانی بہاو کے راستے میں باندھ کر اس کی رفتار میں توازن اور دھیما پن پیدا کردے۔ ایسے میں ''اودھ پنچ'' نے اندھادھند قدامت پرستی اور مغرب کی کورانہ تقلید کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور طنز و مزاح کو اپنے اصلی روپ میں نمودار ہونے کی زبردست تحریک دی۔

> ''اودھ پنچ'' کے طنز و مزاح کا نشانہ زیادہ تر برطانوی حکومت، اس کے خوشامدی، نئی روشنی کے پرستار، سرسید احمد خان اور ان کی اصلاحات تھیں لیکن کبھی کبھی اپنی تہذیب کے اندھے مقلدوں کا بھی مذاق اڑاتا تھا''(1)

طنز و مزاح کے ضمن میں ''اودھ پنچ'' کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے افراد سے زیادہ معاشرے کے غلط رسم و رواج اور سیاست کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا۔ اس نے سب سے پہلے اردو صحافت میں ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی حکومت پر طنز و مزاح کے پردے میں تنقید کی طرح ڈالی۔ اگرچہ اودھ پنچ کا طنز چبھتے ہوئے فقروں اور مزاح پھڑکتے ہوئے جملوں پھبتوں اور چٹکلوں کا حامل تھا مگر اس کے پُر لطف ہونے میں شبہ کم ہی لوگوں کو ہوگا۔ بلا شبہ ''اودھ پنچ'' نے اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھایا۔

''اودھ پنچ'' نے اپنے عروج کے زمانے میں ایسے لکھنے والے پیدا کردیئے تھے جن

---

1 ڈاکٹر عابد حسین، مضمون نگاری طنزیہ و مزاحیہ مضامین غیر مطبوعہ، ص 20

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور ان لکھنے والوں کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں نے ''اودھ پنچ'' کو ایک تحریک بنادیا۔ اس کا ثبوت وہ اخبارات ہیں جو ہندوستان کے کونے کونے سے نکلنا شروع ہوگئے تھے، جیسے 'پنجاب پنچ'، 'لاہور پنچ'، 'جالندھر پنچ'، 'بنارس پنچ'، 'آگرہ پنچ'، 'دکن پنچ' وغیرہ اور 'اودھ پنچ' کے لکھنے والوں میں ایسے نام سامنے آئے جو خود طنز و مزاح کی تاریخ کا مستقبل باب ہیں۔ ''اودھ پنچ'' میں لکھنے والوں کی فہرست لمبی تھی جیسے پنڈت تری بھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی شوق، سجاد حسین، جوالا پرشاد برق، نواب سید محمد آزاد، سید عبدالغفور شہباز، پٹینٹ ٹریڈ مارک، اکبر الہ آبادی وغیرہ تھے۔ ان سارے ادیبوں میں اکبر الہ آبادی کے سواسب نے نثر میں طنز و ظرافت کے پھول کھلائے، چنانچہ احمد علی شوق، جوالا پرشاد برق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، سید عبدالغفور شہباز اور لسان العصر اکبر الہ آبادی نے طنزیہ شاعری میں بھی اپنا مقام بنالیا۔ ان میں ہجر کی شہرت تحریف نگاری کے باعث ہے۔ ان کی تحریفیں ان اولین تحریفوں میں سے ہیں جو مغربی پروڈی کی طرز پر لکھی گئیں۔ چنانچہ ہجر کو پیروڈی کے جدید تصور کی ترویج کے سلسلے میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی تحریف کا اندازہ اس ایک نمونے سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

ایک مہینے سے چپکے بیٹھے ہیں واہ کیا واقعہ نگاری ہے
بیٹھے کوئی نہ آکے دفتر میں نادری حکم اب یہ جاری ہے
کیا کریں اب بچارے اپرینٹس رات دن شغلِ آہ وزاری ہے
ہائے تخفیف اور ٹیکس کے بیچ
رو چکے سب ہماری باری ہے

یہاں ہجر نے بظاہر غالب کی ایک غزل کے تعریف کی ہے لیکن دراصل اس کا سہارا لے کر اپنے زمانے کی اقتصادی بدحالی کو بے نقاب کر گئے ہیں۔

''اودھ پنچ'' کے دوسرے معاون احمد علی شوق ہیں جن کے کلام میں زیادہ تر اودھ کی کھوکھلی معاشرت اور اس کے نام لیواؤں کی بعض مکروہ عادات پر بھرپور طنز موجود ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

انھوں نے مغربی میلانات کے بعض قابل اعتراض پہلوؤں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے تاہم انھوں نے زیادہ تر اپنے معاشرے کو ہی پیش نظر رکھا ہے۔ شوقؔ کے کلام کا یہ نمونہ ان کے طریق کار پر روشنی ڈالتا ہے:

چانڈو سے زمانے میں محبت ہے ہمیں
بمبو پہ دل آگیا ہے الفت ہے ہمیں
دام اپنا رہے یا نہ رہے بھاڑ میں جائے
دنیا میں مدک کا دم غنیمت ہے ہمیں

'اودھ پنچ' کے تیسرے معاون مولوی سید عبدالغفور شہبازؔ ہیں۔ ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز اس کی بے ساختگی ہے۔ وہ مذہب و ملت کو بھی بسا اوقات نشانۂ طنز بناتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا مذہب کی بعض سنگلاخی اقدار میں وہ لچک کے حامی تھے۔ ان کے کلام میں تفکر کا رنگ غالب ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں مزاح کے عناصر زیادہ ابھرنے نہیں پائے۔ البتہ شہبازؔ کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ ضرور ہے کہ اس سے عامیانہ پن کی بو نہیں آتی بلکہ اس میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت موجود رہتی ہے ''قانون قسمت'' کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جو شہبازؔ کے اندازِ نظر کی بہت اچھی وضاحت کرتے ہیں:

شب ہی کو ہے سدا چمکتا چاند — شب ہی کو جگمگاتے کوکب ہیں
کالی رنگت سے تل ہیں نقطہ زیب — جن سے روئے بتاں فریب ہیں
زیب دیتا ہے تن پہ کالا سوٹ — متفق اس پہ کل مہذب ہیں
پاک کعبے کے کالے کالے غلاف — سرمۂ چشم دین و مذہب ہیں
گوری رنگت ہے گر سبب اس کا — ہم میں بھی کالے کم نہیں سب ہیں
پتلیاں گر سپید ہوجائیں — ہر قدم پر قدم مذبذب ہیں
رشتہ مندوں میں خوں اگر ہو سپید — لاکھ اقرب ہوں پھر بھی عقرب ہیں

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کالے گورے پہ کچھ نہیں موقوف
دل کے آنے کے اور ہی ڈھب ہیں

''اودھ پنچ'' کے اس دور کے چوتھے نامور طنز نگار لسان العصر اکبر الٰہ آبادی ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی بجائے خود ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

اکبر کی شاعری کی مدت لگ بھگ ساٹھ سال ہے۔ اس عرصے کا پورا کلام ان کی کلیات (جو چار حصوں میں منقسم ہے) ایک شعری، مجموعے اور مسدس، گنج پنہاں، پر مشتمل ہے۔ کچھ کلام مختلف رسائل، گلدستوں اور نظموں کے مختلف انتخابوں میں بھی ملتا ہے۔ ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا عروج انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے خمس اول میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی سماجی، مذہبی، سیاسی اور معاشی زندگی کی سنگین دیواروں میں مغرب کی طرف سے بڑھتے ہوئے سیلاب نے ایسے شگاف پیدا کر دیئے تھے کہ معاشرے کی ساری عمارت کے گر جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایسے میں اکبر کے ذہن اور بازو میں جنبش پیدا ہوئی اور طنز کے تیز نوکیلے تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔

اکبر الٰہ آبادی نے اپنی شاعری کی ابتداء غزل سے کی وہ ایک عرصے تک غزل میں عشق مجازی کی واردات خالص روایتی لب و لہجہ میں بیان کرتے رہے۔ کہیں کہیں اعلیٰ پایہ کا تغزل، اخلاقیات اور تصوف کے اشعار بھی مل جاتے ہیں لیکن 1877ء سے کچھ عرصہ پہلے ان کی شاعری کا رنگ بدلنے لگا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب اکبر کا شعور پختہ ہونا شروع ہو گیا تھا، نوجوانی کا پُر آشوب دور گزر چکا تھا اور وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ زندگی محض زلف و رخسار کی جنت ہی نہیں ہے۔ 1870ء میں وہ مسل خواں مقرر ہوئے تھے۔[1]

اُس زمانے میں انھوں نے اپنی انگریزی کی استعداد کافی بڑھالی تھی۔ انھوں نے انگریزی نظم و نثر کی کتابوں کا بھی اچھا خاصا مطالعہ کیا تھا۔ دوستوں سے شعر و شاعری پر گفتگو رہتی تھی، سرسید کی تحریک کے زیر اثر ادب میں بھی نئی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ اسی

1 شیخ ممتاز حسین، ''اکبر الٰہ آبادی کی دلچسپ باتیں''، مشمولہ علی گڑھ میگزین اکبر نمبر، ص 143

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد نے 1874ء میں 'نئی شاعری کے مشاعروں' کی بنیاد ڈالی۔ اکبر نے بھی یہ محسوس کیا کہ شاعری کے رُخ کو بدلنا چاہیے۔ ادھر 1877ء میں لکھنؤ سے ''اودھ پنچ'' نکلنا شروع ہوا تو اکبر کو اپنی راہ صاف نظر آنے لگی۔ ان کی طبیعت میں طنز و مزاح کا مادہ تو تھا ہی، ''اودھ پنچ'' کے اجرا کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی شاعری کو ایک نیا رُخ دیا اور اس طرح ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی ابتداء ہوئی۔

پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''اکبر کے مزاحیہ اسلوب اختیار کرنے کا سب سے قوی سبب یہ ہوا کہ اتفاق سے اسی زمانے میں اودھ پنچ جاری ہوا تھا''(1)

اکبر کی شاعری کو عام طور پر بذلہ سنجی یا وٹ کی شاعری کہا گیا ہے اور وہ اس لیے کہ بیشتر موقعوں پر انھوں نے تخیل اور معنی آفرینی کے بجائے صرف لفظی شعبدہ بازیوں سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے لیے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بے بیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

ان اشعار سے یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں مزاح کو تحریک دینے والی چیز شاعر کے سخن ہائے گفتنی کی بے ساختگی نہیں بلکہ اس کی خوبی صناعت اور اندازِ پیش کش ہے۔ دراصل اس قطعے کا سارا حسن اس کی رعایت لفظی میں ہے ورنہ ہوسکتا ہے کہ پردے کے متعلق اکبر کے خیالات محض ایک خاص رجحان کے غماز ہوں اور مزاح سے تہی۔

شروع شروع میں اکبر نے غزل کے روایتی لب و لہجہ میں محبوب کا سراپا اس کے ناز و انداز، ہجر و وصال کی کیفیتوں کو زبان اور محاورے اور چٹخارے کے ساتھ بیان کیا ہے۔ عشق کا یہ بیان سچے درد اور کسک سے خالی ہے رنگین اور شوخ جذبات کا آئینہ دار ہے۔ مثال کے

---

1 جدید اردو شاعری، ص 169

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

طور پر اکبر کے یہ اشعار جوان کے دل کے جذبات و احساسات بیان کرتے ہیں:

دل تو پہلے لے چکے اب جان کے خواہاں ہیں آپ
اس میں بھی مجھ کو نہیں انکار اچھا لیجیے

محبت کر کے ان سے پھنس گئے ہیں ہم تو آفت میں
نہ دل قابو میں آتا ہے نہ ان پر زور چلتا ہے

غزل گوئی بنیادی طور پر حسن و عشق کا بیان ہے مگر غزل گو شعراء نے غزلوں میں حیات وممات کے گوناگوں مسائل کو بھی بیان کیا ہے، اس ضمن میں جب ہم اکبر کی شاعری کو دیکھتے ہیں تو لگتا ہے کہ ان کی غزلوں میں حسن و عشق کا ذکر بہت کم ہے اور زندگی کے دوسرے مسائل کا ذکر زیادہ ہے۔ اس دور میں جب کہ وہ عشق و محبت کے گیت گانے میں مصروف تھے، ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں کہیں نہ کہیں انھوں نے دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا ہے، اخلاقیات پر روشنی ڈالی ہے مثلاً:

حباب آسا اٹھایا بحر ہستی میں جو سر اپنا
بنایا بس وہیں موجِ فنا نے ہمسفر اپنا
اے خوفِ مرگ دل میں جو انسان کے تو رہے
پھر کچھ ہوس رہے نہ کوئی آرزو رہے

حاصلِ عمر سوا موت کے جب کچھ بھی نہیں
چار دن کے لیے یہ عیش و طرب کچھ بھی نہیں

یا پھر اکبر الہ آبادی کا یہ شعر جو ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اسی زمانے کا ہے۔ اکثر لوگ یہ جانے بغیر کہ یہ اکبر الہ آبادی کا شعر ہے، اسے پڑھتے رہتے ہیں:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

بظاہر اس شعر میں محبوب کی طرف اشارہ ہے لیکن اس میں اکبر کی مستقبل کی شاعری کے تیور دیکھے جاسکتے ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سے مطلب وہ غیر ملکی حکومت ہو جو ہندوستان پر ہر قسم کے ظلم وستم ڈھا رہی تھی جس کی کہیں داد تھی نہ فریاد۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دور کے آخر میں جب وہ اپنی ''زلف و رخسار کی جنت'' سے کبھی باہر جھانکتے تو انھیں اپنے گلستاں کی ہوا بدلنے کا احساس ہوتا تھا۔

کیا میرے عہد میں بدلی ہے گلستاں کی ہوا

تو ایسا لگتا ہے کہ انھیں قوم کی بدحالی، مذہب سے بیگانگی اور ملت کے انتشار کا احساس بھی ہو چلا تھا۔

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ
مگر افسوس یہی ہے کہ مسلمان نہ رہے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب ان کی شاعری محبوب کے ناز وانداز اور حسن و ادا سے آگے دیکھنے لگی تھی اور وہ یہ روایتی عشقیہ شاعری کے کوچے سے نکلنا چاہتے تھے۔ اب ان کی توجہ ملک کے سیاسی اور سماجی حالات کی طرف ہونے لگی تھی۔ ان کو اس کا احساس بھی ہو چلا تھا کہ ان کی شاعری پرانے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے، جس کا مقصد اس وقت لوگوں کو خوش کرنا اور ''اپنے جذبات کو آسودہ کرنا تھا''[1]

اب وہ زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھنے لگے تھے، ہر طرف تبدیلیاں آرہی تھیں دوسرے میدانوں میں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان سے اکبر چاہے پوری طرح متفق نہ سہی مگر ادب میں جو تبدیلیاں آرہی تھیں اسے وہ یقیناً خوش آمدید کہتے ہیں:

غزل ایسی پڑھو مملو جو ہو اعلا مضامین سے
کرو اب دوسرے کوچے میں اے اکبر گزر اپنا

اور اس طرح اکبر الہ آبادی نے اپنا قدم دوسرے کوچے میں رکھ دیا اور یہ وہ کوچہ تھا جہاں ہندوستانی تہذیب اور معاشرہ عجب بحرانی دور سے گزر رہا تھا۔ بقول پروفیسر

1 شیخ ممتاز حسین، ''اکبر الہ آبادی کی دلچسپ باتیں''، مشمولہ علی گڑھ میگزین اکبر نمبر، ص 141

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کلیم الدین احمد:

''یہ وہ زمانہ تھا جب مختلف تمدنوں میں زبردست تصادم ہوا تھا اور تصادم کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی تمدن کے شیرازے بکھرنے لگے تھے اور انگریزی تمدن اپنی دلفریبی کا سکہ جمارہا تھا۔ اپنے محاسن فراموش ہو چلے تھے اور حسنِ غیر میں نگاہیں محو تھیں''۔(1)

اکبر نے اپنی شاعری کے ذریعے ایک طرف تو محویت کے اس طلسم کو توڑنے کی کوشش کی، دوسری طرف تہذیب و تمدن کی تقلید میں معاشرے میں جو مضحکہ خیز صورتِ حال ہوگئی تھی اس کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا۔ ان کی شاعری کے موضوعات مغربی تہذیب کے نقائص اس کے مقلدوں کی ہیئت کذائی، غلط طرزِ فکر، ان کی مذہب سے بیگانگی، آزادیٔ نسواں اور سرسید کی تحریک، مغربی تہذیب کی تقلید کی اندھا دھند تقلید سے بچانے کے لیے ایک تو ان کے غلط طریقۂ کار پر تنقید کی اور دوسری طرف اس تہذیب کی خامیوں کو نمایاں کیا تاکہ جو مرعوبیت کی فضا قائم تھی وہ ختم ہوجائے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنی شاعری کا سہارا لیا اور شاعری میں انھوں نے ایسا مزاحیہ انداز اختیار کیا کہ ان کے انگریز حاکم جن کی حکومت میں وہ خود بھی اعلیٰ عہدے (جج) پر فائز تھے اور جن کے خلاف وہ لکھ رہے تھے، ناراض نہ ہوں اور اپنی قوم، جن کی بے راہ روی کی وہ نشاندہی کررہے تھے، خفا نہ ہوں۔ ان کے ظریفانہ اور مزاحیہ رنگ اختیار کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریز قوم کے اقتدار کا رعب طاری ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔ وہ ان کا مذاق اُڑاتے، ان پر ہنسے اور تمسخر اڑاتے۔

بہت شوق انگریز بننے کا ہے
تو چہرے پہ اپنے گلٹ کیجیے گا

اکبر نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنے قوم کی اصلاح کے لیے شاعری کو استعمال کیا۔ اکبر جو اسلامی تاریخ و تہذیب، ثقافت و حکمت، فلسفہ اور ادب سے بخوبی واقف تھے وہ

---

1 کلیم الدین احمد، سخن ہائے گفتنی، ص 333

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم، تہذیب و ثقافت کے منفی پہلو سے آگاہ کرنا چاہتے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ مشرق میں مغربی تہذیب کی برائیاں درآمد کی جائیں۔ اس کے لیے انھوں نے ہجو (Satire) سارے اقسام استعمال کیے مثلاً۔

طنز (Irony)

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

یہاں ترقی کی نئی راہیں طنزاً استعمال ہوا ہے۔ میاں کا مسجد سے نکلنا اور بیبیوں کا حرم سے نکلنا ترقی نہیں تنزلی کی علامت ہے۔

ظرافت (Wit)

عمرگزری ہے اسی بزم کی سیاحی میں
دوسری پشت ہے چندے کی طلبگاری میں

مزاح (Humour)

دفترِ رز نے اٹھا رکھی ہے آفت سر پر
خیریت گزری کہ انگور کی بٹیا نہ ہوا

اکبرالہ آبادی نے انگریز قوم اور سرسید احمد خاں کے خلاف بہت کچھ لکھا اور انھیں طنز و مزاح کا نشانہ بنایا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکبر نے انگریز قوم کی ترقی پسندیوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس کے مقابلے میں اپنی قوم کو بے علم اور بے ہنر پایا۔ وہ اپنی قوم کی بے حسی پر سخت دل برداشتہ رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی قوم بھی مغرب کی قوموں کی طرح علم و ہنر حاصل کر کے اور ترقی کے راستے پر گامزن ہو، مثلاً ان کے یہ اشعار:

حال دنیا سے بے خبر ہیں آپ گو تقدس مآب بے شک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے چاہ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

اکبر مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے جس کی بنیاد گہری اور مضبوط تھی۔ وہ مغرب کی مادی تہذیب کے سخت خلاف تھے جس کی چکا چوند سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو رہی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

تھیں اور احساس کمتری کا شکار ہو رہے تھے۔ اکبر مغربی طرزِ زندگی کو خودکشی کے مترادف سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں:

دستار و پیرہن گم اور جیب خالی
تہذیب مغربی نے ہم کو پھاڑ ڈالا
واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کردیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کرلی
نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کرلی

ایک طرف مشرقی تہذیب و روحانیت تھی تو دوسری طرف مغربی تہذیب کی سائنس اور مادی ترقی تھی مثلاً:

اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق و رف رف
ٹکٹکی بندھ ہوگئی قوم کی انجن کی طرف

پیروڈی:

گل پھینکے ہیں یورپ کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے نیچر و سائنس بھلا کچھ تو ادھر بھی

کلیات اکبر پر سرسری نظر ڈالتے ہی سرسید احمد خان سامنے آجاتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اکبر نے سرسید پر جس انداز سے اور جس کثرت سے اشعار کہے ہیں، کسی اور پر نہیں کہے۔ دراصل اکبر کو سرسید اور علی گڑھ تحریک سے بھی کوئی دشمنی نہ تھی۔ ایک مصلح کی حیثیت سے وہ ان کے دشمن ہو بھی کیسے سکتے تھے؟ دونوں نیک نیتی سے قومی فلاح کے آرزومند تھے۔ دونوں چاہتے تھے کہ مسلمان بے عملی، تنگ نظری اور جہالت سے نجات پاکر، غیور، وسیع النظر اور صاحبِ عمل بن جائیں۔ اصلاحِ قوم کے سلسلے میں دونوں کی نظر ایک ہی منزل پر تھی۔ منزل تک پہنچنے پہنچانے کی راہیں الگ الگ تھیں۔ سرسید اور ان کی تحریک علی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

گڑھ کے زیر اثر مغرب سے مرعوبیت، اپنی چیزوں سے نفرت، مذہب و اخلاق سے بیگانگی، ابن الوقتی، خود فراموشی اور مغرب کی کورانہ تقلید کا جو رجحان عام ہو رہا تھا اکبر اسے پسند نہ کرتے تھے۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ اکبر کو علوم جدیدہ، عقلیت اور سائنس سے نفرت تھی۔ ایسا نہیں ہے۔ سرسید احمد خان ان کے ذریعے اصلاحِ دین کا فرض جس طرح ادا کرنا چاہتے تھے، اسے البتہ وہ مستحسن خیال نہ کرتے تھے چنانچہ جس شدت کے ساتھ سر سید نے دینی امور اور مذہبی عقائد میں عقلیت و سائنس کی مداخلت روا رکھی، اسی شدت کے ساتھ اکبر نے ان کے اس رویے کی مخالفت کی۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی شاعرانہ قوت زیادہ تر اسی کام میں صرف ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے سرسید پر طنز کے تیر بھی برسائے۔

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یونہی کہ گویا آبِ زمزم مے میں داخل ہے

ہے یہی بہتر علی گڑھ جا کے سید سے کہوں
مجھ سے چندہ لیجئے، مجھ کو مسلمان کیجیے

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ
مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

نظر ان کی رہی کالج کے بس علمی فوائد پر
گرائیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اشعار میں سرسید کی ذات یا ذاتی صفات کو نہیں بلکہ ان کی تحریک علی گڑھ کے بعض نتائج و اثرات کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ علی گڑھ تحریک چونکہ ایک ہمہ گیر تہذیبی و تعلیمی تحریک تھی اس لیے صغیٰ کی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے اچھے یا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

برے اثرات سے محفوظ نہ تھا۔ سائنس، سائنسی آلات کے اثرات، حکومت و قیادت کی روایات، مجلسی آداب و اخلاق، مذہبی عقائد و خیالات و طریقۂ تعلیم و تدریس اور علوم و فنون سبھی اس تحریک سے متاثر ہو رہے تھے۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اکبر سرسید کا ذکر کرتے اور ان چیزوں کو نظر انداز کر دیتے۔ چنانچہ انھوں نے ان مسائل پر رائے زنی کی ہے اور بار بار کی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ رجعت پسند و تنگ نظر تھے یا سرسید اور علی گڑھ تحریک کے دشمن تھے، کسی طرح درست نہیں ہے۔ انھوں نے سائنس، عقلیت اور علم و فن کا مذاق فی نفسہٖ اُڑایا ہی نہیں، ہاں سرسید دینی اصلاح کے لیے اُن کا استعمال جس طرح کر رہے تھے، اس کا مذاق انھوں نے ضرور اڑایا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار:

ابتدا کی جناب سید نے
جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا جو یونیورسٹی پہ ہوئی
قوم کا کام اب تمام ہوا
کالج و اسکول و یونیورسٹی
قوم بے چاری اسی میں مرگئی
کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی
عہدوں سے آرہی ہے صدا دوردو رکی
رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

یہ اشعار بھی اگر اکبر الٰہ آبادی کو سمجھنے کے لیے ناکافی ہیں تو اس سلسلے میں ان کے وضاحتی بیان پر نظر ڈالتے چلیے۔ کہتے ہیں۔

''ہماری قوم اس قدر غافل اور مجہول ہو چکی ہے کہ اگر میں مسلمانوں کو دو روپے کی تمدنی یا مذہبی کتاب پڑھنے کو دوں اور اس کتاب کے مفید ہونے کا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

یقین بھی دلادوں، تب بھی وہ پڑھنے پر تیار نہ ہوگا اور یہی سبب ہے کہ
میں اپنے کلام کو ظرافت کی چاشنی سے مرغوب تر بنادیتا ہوں تاکہ لوگ ہنس کر
متوجہ ہوں اور پھر غور کریں''(1)

اکبر الہ آبادی نے اس طرح کا اظہار خیال ایک جگہ نہیں، سینکڑوں جگہ کیا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا کہ وہ سعی و عمل کے قائل نہ تھے یا بے جا توکل و قناعت اور مریض و مجہول روحانیت کا پرچار کررہے تھے، کسی طرح درست نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ خود سعی و عمل کی تلقین کیوں کرتے؟ خود انگریزی کیوں پڑھتے؟ اپنے بیٹے عشرت کو انگلستان میں تعلیم کے لیے کیوں بھیجتے اور مسلمانوں کی بے بسی پر آنسو کیوں بہاتے؟

اس میں شک نہیں کہ اصلاحی نقطۂ نظر کے سلسلے میں دونوں (اکبر اور سرسید) میں ایک نمایاں فرق تھا جس نے اکبر کو سرسید کے ساتھ قدم ملا کر چلنے سے باز رکھا۔ لیکن اگر صحیح طور پر دیکھا جائے تو اکبر کو سرسید تحریک کے صرف ایک حصے سے جس میں مذہبی آمور و اقدار کو سائنس کے اصول و تجربات کے عین مطابق ثابت کرنے کی کوششیں کی جارہی تھی، اختلاف تھا اور یہ اختلاف ذاتی نہیں اصولی تھا۔ کلی نہیں جزوی تھا۔ وہ سرسید کی تحریک اصلاحی کی معاشی و تعلیمی افادیت کو محسوس کرتے تھے۔ لیکن سرسید مذہب اور سائنس کے درمیان جس طرح کا سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے۔ اکبر اسے پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی ان کے سامنے سرسید کی تحریکِ اصلاح کو من و عن قبول کرنے کا سوال آیا تو انھوں نے اپنا نقطۂ نظر اس طور پر واضح کردیا کہ:

سید صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور
کہتا نہیں میں تم رہو اس سے نفور
سوتوں کو جگادیا انھوں نے لیکن
اللہ کا نام لے کے اٹھنا ہے ضرور

---

1 شیخ ممتاز حسین، ''اکبر الہ آبادی کی دلچسپ باتیں'' مشمولہ علی گڑھ میگزین اکبر نمبر، ص 102

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

تہذیب وہ ہے کہ رنگِ مذہب بھی ہو
آزاد وہ ہے جو مؤدّب بھی ہو
تزئین وہ ہے کہ خاکساری ہو ساتھ
اسپیچ وہ ہے کہ یارب بھی ہو

تم شوق سے کالج میں پھلو، پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اُڑو، چرخ پہ جھولو
لیکن یہ سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

ان اشعار سے یہ بات صاف واضح ہوجاتی ہے کہ اکبر نہ تو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے مخالف تھے اور نہ ہی بیزار بلکہ وہ تو اس بات کی تلقین بار بار کررہے تھے کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ اپنی پہچان ایک مسلمان کو برقرار رکھتی ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو کچھ تعلیمات دی ہیں، ان پر عمل کریں، مسلمانوں کا مذہب کیا ہے؟ ان کی تہذیب کیا ہے؟ ان کی شناخت کیا ہے؟ اس بات کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اگرچہ اس کے لیے سرسید احمد خان نے مختلف طریقہ کار اپنانے کی کوششیں کیں، لیکن کہیں کہیں وہ اپنے راستے سے بھٹک بھی گئے۔ حالانکہ اکبرالہ آبادی سر سید کے خلوص اور جذبۂ ایثار وعمل کے قائل تھے۔ ان کے ذاتی اوصاف کا اعتراف اکبر نے کئی جگہ اس طور پر کیا ہے۔

واہ رے سید پاکیزہ گہر، کیا کہنا
یہ دماغ اور حکیمانہ نظر، کیا کہنا
قوم کے عشق میں یہ سوزِ جگر، کیا کہنا
ایک ہی دُھن میں ہوئی عمر بسر، کیا کہنا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ پوچھو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی، میں تو کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ذاتی خوبیوں کے اس اعتراف کے باوجود سرسید نے قومی و دینی اصلاح کے لیے جو طریقۂ کار اختیار کیا تھا، اس سے وہ متفق نہ تھے۔ جتنی نیک نیتی سے سرسید یہ چاہتے تھے کہ مسلمان زندہ رہیں، اتنی ہی نیک نیتی سے اکبر کی یہ کوشش تھی کہ مسلمان مسلمان رہ کر زندہ رہیں۔ اس کے لیے اکبر نے مغرب کو نشانہ طنز بنانے اور مشرق کو ایک مقام بلند پر دکھانے کے بجائے ان دونوں میں توازن پیدا کرنے کا درس دیا۔ محمد احسن فاروقی لکھتے ہیں کہ:

''اکبر محض بدلتی ہوئی قدروں کے ترجمان سے آگے بڑھ کر دائمی قدروں کے طرفدار دکھائی دیتے ہیں''(1)

اکبر الٰہ آبادی جدید تصورات اور نئے خیالات کو صرف اس لیے قبول نہیں کرنا چاہتے ہیں کہ یہ حاکم قوم کا حکم ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم غور و فکر کر کے مفید اور کار آمد چیزوں کو اپنائیں کیونکہ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ:

''ملک تو اپنے ہاتھوں سے جا ہی چکا تھا، ذہن پر بھی قبضہ جما رہا تھا۔ سیاسی غلامی، ذہنی غلامی کی پیامبر تھی''(2)

اکبر نے اپنے کلام میں ڈارون کی ارتقائے انسانی کی تھیوری کا بہت مذاق اڑایا ہے۔ وہ اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے لیکن اس کا جوئب لباب ہے اس کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ڈارون صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے
میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے

---

1 محمد احسن فاروقی، ''اکبر اور یورپ'' مشمولہ علی گڑھ میگزین اکبر الٰہ آبادی نمبر (1950ء)، ص 107

2 کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر (بک امپوریم، ہبری باغ، پٹنہ، 1985ء)، ص 59

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

بولے منصور کہ خدا ہوں میں
ڈارون بولے جوزنا ہوں میں

بنے بندر سے ہم انسان ترقی اس کو کہتے ہیں
ترقی پر بھی نیٹو بدنصیبی اس کو کہتے ہیں

ان اشعار کی خوبی یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جو اس تھیوری کو مانتے ہیں، ان اشعار سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہی مزاح نگار کی کامیابی ہے۔ جو اکبر الہ آبادی میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ ویسے بھی اکبر الہ آبادی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے ہم ان کی علامتوں اور اصطلاحوں کو سمجھنے کی کوشش کریں وہ جو الفاظ اپنی شاعری میں استعمال کرتے ہیں ان کے لغوی معنی کے علاوہ دوسرے وسیع معنیٰ بھی ہوتے ہیں اور وہ عام طور پر آخر الذکر معنی میں ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں مثلاً جب وہ کہتے ہیں کہ:

چھوڑ لٹریچر کو، اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مذہب سے تعلق ختم کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا
دورِ فلک کا ماجرا آپ سے کیا کروں بیان
تفرقہ دیکھئے ذرا ہم پہ بھی ہیں عجیب دن
عقل سپرد ماسٹر، مال سپرد آں جنا
جان سپرد ڈاکٹر، روح سپرد ڈارون

ان اشعار میں اکبر الہ آبادی ایک طرف تو اس تعلیم پر طنز کرتے ہیں کہ جس کا مطمع نظر بس یہ ہے کہ وہ ہندوستانیوں کو کلرک یا زیادہ سے زیادہ ڈپٹی کلکٹر بنادے۔ وہ بنگلہ میں رہیں۔ ڈبل روٹی کھائیں۔ مذہب سے بیگانہ ہوجائیں اور خود کو ترقی یافتہ اور مہذب سمجھیں۔ دوسری طرف وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس صورت حال میں ہمارے ارادے اور

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

انتخاب کو دخل نہیں ہے۔ سب کچھ غیروں کا ہے۔ نہ عقل اپنی ہے، نہ مال، نہ جان، نہ روح، وہ یہ جتانا چاہتے ہیں کہ اس ترقی کے تصور میں ہمارے غور وفکر کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ ہماری حالت اس ناؤ کی سی ہے جس کے پتوار دوسروں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر بار بار اس طرح کے اشعار لکھ کر اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے انھیں اس بات کا اشارہ کرتے رہے کہ وہ (ہندوستانی قوم) اپنی قوم کی بھاگ ڈور خود اپنے ہاتھوں میں لے۔ اپنی تہذیب اور اپنی پہچان کو نہ کھوئیں۔ مگر اس بات سے قطع نظر کہ اکبر الہ آبادی کے اس مخصوص طنزیہ طریق کار کے پس پشت جو جذبہ کارفرما تھا وہ درست اور حق بجانب تھا یا نہیں، یہ بات یقیناً کہی جاسکتی ہے کہ ان کے طنز نے تعمیری کام ضرور سرانجام دیا۔ وہ اس طرح کہ اگرچہ ان کے لیے مغربی تہذیب کے سیلاب کو روکنا ممکن نہیں تھا اور نہ اس سیلاب کا رک جانا ہی ہماری ترقی کے لیے سود مند تھا۔ تاہم اس سیلاب کی تندی اور شدت میں دھیما پن پیدا کرنا واقعی ضروری تھا اور اکبر الہ آبادی کے عقائد اور مقاصد چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہوں یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی طنز نے مغربی تقلید کی طوفانی رو میں دھیما پن ضرور پیدا کیا اور یوں اپنے ملک کی ان ادبی، تمدنی اور مذہبی روایات کا تحفظ کیا جو بصورتِ دیگر یکسر فنا ہوجاتیں۔

اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری میں مغربی تہذیب و تمدن ہی پر طنز نہیں کیا بلکہ انھوں نے غیر ملکی حکومت کے ظلم وستم پر احتجاج بھی کیا ہے۔ اس کی پالیسیوں پر کڑی تنقید بھی کی ہے۔ ان کو طنز و مزاح کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ جب کہ وہ سرکاری نوکر تھے، پنشن یافتہ تھے، حکومت کے عتاب سے ڈرتے بھی تھے لیکن ظرافت کے پردے میں وہ بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔

موقعۂ بحث نہیں صاحبِ اقبال ہیں آپ
میری ہر بات بری آپ کی ہر بات اچھی

بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکبر الہ آبادی کی شاعری کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف حالات کی تصویر کشی ہی نہیں کی بلکہ گہرائی فکر کے ساتھ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اس کا تجزیہ بھی کیا ہے اور گہری ایمائیت اور غیر معمولی قدرت بیان سے شعر کو ایسے سانچے میں ڈھالا ہے جو کچھ نہیں کہا وہ بھی سامنے آجاتا ہے۔[1] اکبر نے اپنے اس قسم کے اشعار کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھا ہے:

''درحقیقت جو شعر میں نے آپ کو لکھے تھے وہ شعر نہ تھے، پولیٹیکل ہنگامے کے متعلق ایک اظہار رائے تھا''۔[2]

اکبرالہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے متعلق ایک آخری نکتہ یہ ہے کہ اکبر اگرچہ مغرب اور مغربیت کے سب سے زیادہ مخالف تھے تاہم وہ پہلے اردو شاعر ہیں جو باقاعدہ طور پر اکابر کے طرزِ عمل اور ہنگامی واقعات پر طنز کی طرف متوجہ ہوئے۔ دراصل یہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ ہماری سیاسی زندگی میں برق رفتار تبدیلیاں پیدا ہورہی تھیں اور ایک حساس شاعر کا ہنگامی واقعات سے بے نیاز رہنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ شاید اس لیے تھا کہ اکبر نے بعض معاملات پر اپنے مخصوص انداز میں اظہار خیال کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس روشِ خاص سے انھیں کوئی طبعی مناسبت نہیں تھی۔ نتیجتاً انھوں نے سیاسی میدان میں جولانیاں دکھانے کے بجائے اسے اپنے معاصر شبلی نعمانی اور آنے والے دور میں مولانا ظفر علی خان مرحوم کی تگ و تاز کے لیے چھوڑ دیا اور یوں طنز کی اس روش کو مولانا شبلی اور ان کے بعد مولانا ظفر علی خان نے ہی پروان چڑھایا اور ہنگامی معاملات پر طنزیہ لہجے میں اظہار خیال کرتے رہے۔

ہنگامی مسائل کے سلسلے میں شبلی اور ظفر علی خان کی نظموں میں ایک بڑا فرق یہ نظر آتا ہے کہ ظفر علی خان کی نظموں میں تو سمیت کا عنصری غالب ہے لیکن شبلی کا کلام اس عنصر سے بڑی حد تک پاک و محفوظ ہے۔ دوسرے، جہاں ظفر علی خان کی طنز بیشتر اوقات جذبات کی فراوانی اور رجوش و ولولہ کی شدت کے باعث مزاح سے اپنا دامن چھڑا لیتی ہے وہاں شبلی کی طنز میں مزاح کا عنصر ضرور موجود رہتا ہے۔ تیسرے ظفر علی خان کے ہاں بات

---

1 وقار عظیم، ''اکبرالہ آبادی کا گاندھی نامہ'' مشمولہ رسالہ ادب لطیف (1960ء)، ص 17

2 عبدالماجد دریابادی، مشاہیر کے خطوط، ص 64

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کرنے کا انداز بلا واسطہ ہے اور شبلی وار کرنے میں عموماً بالواسطہ طریق کار اختیار کرتے ہیں۔ لیکن دونوں شاعروں نے زندگی اور معاشرے کے عالمگیر مسائل کے بجائے زیادہ تر اپنے اپنے زمانے کے ہنگامی مسائل ہی پر طنز کی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اکبر الٰہ آبادی نے ہنگامی مسائل اور اکابر کے طرز عمل پر طنز کا آغاز کیا تھا۔ شبلی اور ظفر علی خاں نے اکبر کی طنز کے صرف ایک پہلو کا تتبع کیا اور زیادہ تر ہنگامی مسائل اور اکابر کے طرز عمل پر طنزیہ لہجے میں اظہارِ خیال کیا مگر ظریف لکھنوی نے اکبر الٰہ آبادی کے طنز کے دوسرے پہلو کا تتبع کیا اور زیادہ تر ان سماجی رجحانات کو ہدفِ طنز بنایا جو ان ہنگامی مسائل کے پس منظر میں موجود تھے اور جو روز بروز شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔

ظریف لکھنوی کا نام ''اودھ پنچ'' کے دوسرے دور سے وابستہ ہے۔ لیکن بہت جلد یعنی انیسویں صدی کی تیسری دہائی تک پہنچتے پہنچتے ''اودھ پنچ'' کا شیرازہ بکھرنے لگا اور حکیم ممتاز حسین عثمانی کے لیے اس کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ ان حالات میں 1931ء میں ''سرپنچ'' جاری ہوا اور بہت جلد اس نے اپنے کالموں، کارٹونوں اور مزاحیہ تخلیقات سے اردو داں طبقے کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ظریف لکھنوی، چوہدری محمد شہباز اور احمق پھپھوندوی وغیرہ نے سرپنچ کی آبرو رکھ لی۔ ان فنکاروں میں ظریف لکھنوی کا کلام اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ظریف لکھنوی کا مزاحیہ کلام ''کلام ظریف''، ''مزاح ظریف''، ''ظرافت ظریف'' اور ''فرمانِ ظریف'' کے عنوانات سے شائع ہوا تھا۔ سرپنچ سال نو کے موقع پر ''سرپنچ گزٹ'' شائع کرتا جس میں شعراء کو خطابات دیئے جاتے تھے۔ ظریف کے لیے ''ملک الشعراء'' کے خطاب کی تجویز سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''سرپنچ'' کے طنز و مزاح نگاروں میں ان کا کیا مقام تھا۔ ظریف لکھنوی کی طبیعت میں بلا کی شوخی اور ظرافت تھی۔ ان کے طنزیہ اشعار کا لب و لہجہ نرم، تیکھا اور پُر اثر تھا۔ ان کی نظمیں ''سیاحت ظریف''، ''شہر آشوب'' اور ''الیکشن'' کسی خاص سیاحت، واقعہ یا الیکشن کی روداد بیان نہیں کرتیں بلکہ سماج کی ان ناہمواریوں کو طشت از بام کرتی ہیں جو معاشرے کے سطحی واقعات کے پسِ پشت قائم ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ظریف کی طنز میں زندہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

رہنے کے عناصر نسبتاً زیادہ ہیں۔

بحیثیت مجموعی ظریف لکھنوی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی نظموں کا پایہ تو خاصا بلند ہے لیکن ان کی غزلوں کے بیشتر اشعار انتہائی عامیانہ قسم کے ہیں اور مضحکہ خیز شاعری کے نمونے بن گئے ہیں۔ظریف جیسے اچھے طنز نگار کا یہ روپ اختیار کرنا یقیناً افسوس ناک ہے۔ چند اشعار ثبوت کے طور پر ہم پیش کر سکتے ہیں۔ مثلاً:

کیا کرتے ہیں استعمال جو کھانے میں پاپڑ کا
رہا کرتا ہے ان کے پیٹ میں اک شور گڑ بڑ کا

بزم میں دھوبیوں کی بیٹھ کے کہتا ہے وہ شوخ
ماش کی دال سے بھاتا ہے بہت بھات مجھے

کہا معشوق کو قاتل تو بھنگی کیوں نہیں کہتے
یہ کیا جلاد ہو سکتا ہے ہو نہیں سکتا

''اودھ پنچ'' کے بعد اردو کی طنزیہ شاعری ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے۔ اس دور میں اگر چہ شبلی، ظفر علی خان، ریاض خیر آبادی نے طنزیہ و مزاحیہ اشعار سے اپنے زمانے کے ہنگامی مسائل پر طنز کیا، لیکن ان میں سب اہم نام علامہ اقبالؔ کا ہے، جن کی طنزیہ شاعری ایک نئے رجحان کا پتہ دیتی ہے یا یوں کہیے کہ اردو کی طنزیہ شاعری میں اکبر الہ آبادی کی اجتہادی روش کے بعد اگلا اہم قدم علامہ اقبالؔ نے اٹھایا جب انھوں نے اردو شاعری میں طنز کو عالمگیر انسانی مسائل سے روشناس کرانے میں کامیابی حاصل کی اور اپنی قادرالکلامی کے طفیل اس خاص انداز میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ لیکن چونکہ بنیادی طور پر اقبالؔ کی بلند نظری ہنگامی قدروں کے مطالعے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا یہ ظریفانہ رنگ کچھ جم نہ سکا اور وہ بہت جلد اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ لیکن ایسا کرنے سے طنز کی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

طرف اقبالؔ کا فطری رجحان ختم نہیں ہوا بلکہ انتہائی لطیف انداز میں ان کی سنجیدہ شاعری میں سرایت کر گئیں۔ نتیجتاً کلام اقبالؔ میں سنجیدگی اور ظرافت کا ایسا امتزاج پیدا ہوا جو ہر عظیم شاعر کے کلام کا طغرائے امتیاز ہوتا ہے اور جن کے طفیل وہ اک تبسم زیر لب کے ساتھ زندگی کے مد و جزر اور نشیب و فراز کو دیکھتا اور دکھاتا ہے۔

علامہ اقبالؔ کا کمال یہ ہے کہ ان کی طنز کی شان انسان دوستی، اصلاح پسندی اور آفاقی تصورات پر ٹوٹتی ہے۔ وہ ''تہذیب حاضر'' کو ''انسانیت کے جوہر'' سے محروم نہیں دیکھنا چاہتے تاکہ ''زاغوں کے تصرف'' سے ''عقابوں کے نشیمن'' بچے رہیں۔ وہ اپنی شاعری میں نشتر زن بھی نظر آتے ہیں اور مرہم ساز بھی۔ وہ ''بتانِ عصر حاضر'' میں ''ادائے کافرانہ'' اور ''تراش آذرانہ'' دیکھنے کے آرزو مند تھے۔ ان کی طنزیہ شاعری میں سنجیدگی اور ظرافت کا یہ امتزاج ان کی فطری متحمل مزاجی اور اعتدال کا غماز ہے۔ پھر ان کے ہاں بالعموم ایک ایسا بالواسطہ انداز موجود ہے کہ طنز کی نشتریت تو قائم رہتی ہے لیکن کسی شدید ردِ عمل کو تحریک نہیں ملتی۔ اس طریق کار کی ایک اچھی مثال ان کی نظم ''نصیحت'' ہے جس میں انھوں نے طنز کرنے کے لیے ایک نیا زاویہ منتخب کیا ہے:

میں نے اقبالؔ سے از راہِ نصیحت یہ کہا
عامل روزہ ہے تو اور نہ پابندِ نماز
تو بھی ہے شیوۂ ارباب ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس لب پہ تیرے ذکرِ حجاز
جھوٹ بھی مصلحت آمیز تیرا ہوتا ہے
تیر انداز تملق بھی سراپا اعجاز
در حکام بھی تجھ کو مقام محمود
پالیسی بھی تیری پیچیدہ تر از زلفِ ایاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردۂ خدمت دین میں ہوسِ جاہ کا راز

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

نظر آتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن
اثر وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز
دست پرورد تیرے ملک کے اخبار بھی ہیں
چھیڑنا فرض ہے جن پر تیری تشہیر کا ساز
اس پہ طرّہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے
تیری مینائے سخن میں ہے شراب شیراز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں بھی
تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریکِ تگ و تاز
غم صیّاد نہیں اور پر و بال بھی ہیں
پھر سبب کیا ہے نہیں تجھ کو دماغ پر واز
عاقبت منزلِ ماوادیٔ خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز
سن کے کہنے لگا اقبالؔ بجا فرمایا
بات جو سچ ہے بتاؤں جو نہ ہو فاش یہ راز
ڈھب مجھے قوم فروشی کا کوئی یاد نہیں
اور پنجاب میں ملتا کوئی استاد نہیں

سنجیدگی اور ظرافت کا یہ امتزاج اقبالؔ کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اپنی طنزیہ شاعری میں پہلا نشانہ اپنی ہی قوم کو بنایا۔ لیکن یہاں وہ کہنے کی باتیں کسی کھردرے اور نصیحت آموز انداز سے پیش نہیں کرتے بلکہ بڑے پیار سے اپنے پر شفقت ہاتھ ناظر کے شانوں پر رکھ دیتے ہیں اور جب باتیں کرنے لگتے ہیں تو نرم اور خوبصورت الفاظ کے عقب میں طنز کے زہر آلود تیر جھپٹتے ہیں اور ناظر ان کی چبھن کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ان کی طنز کا دوسرا دائرہ مغربی تہذیب کی ساری بے اعتدالیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ وہ جب مغربی ہوا کے طوفانی تھپیڑوں سے اپنی تہذیب کے تناور درختوں

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کی ٹہنیوں کو ٹوٹتا ہوا دیکھتے ہیں تو بے اختیار ہو جاتے ہیں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدِ نظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

یہ پوری نظم طنز سے بھری ہوئی اور غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ پردہ اٹھنے کے بعد کیا ہوا یہ ہم سب دیکھ رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کل مغربی تعلیم کے زیرِ اثر سب سے زیادہ حملہ اوٹ یعنی پردہ پر ہو رہا ہے۔ عورتوں کو بے پردہ ہونے پر اکبر الہ آبادی کہتے ہیں:

''اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا''

اور اقبال کہتے ہیں:

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

علامہ اقبال کی طنز کا آخری دائرہ زندگی اور کائنات کے بہت سے مسائل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اقبال ایک مفکر کے دھیمے تبسم کے ساتھ کائناتی مسائل کے رموز و نکات کی تقسیم پر آمادہ ہو جاتے ہیں، خالق کائنات سے ان کا براہ راست خطاب اپنے اندر رندی و بے باکی کے علاوہ طنز کے بہت سے تیز نشتر بھی پنہاں رکھتا ہے اور اس کلام کے مطالعے کے بعد ناظر محسوس کرتا ہے کہ اس نے بہت بلندی پر سے زندگی کے نشیب و فراز پر ایک نگاہ ڈالی ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اگر کج رہی ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا

علامہ اقبالؔ کے سامنے اکبرؔ الٰہ آبادی کا کلام تھا لیکن چونکہ اکبرؔ کے یہاں مزاح کا عنصر زیادہ ہے جب کہ اقبالؔ کے ہاں ظریفانہ کلام کے ساتھ ساتھ طنز کی زبردست لے موجود نظر آتی ہے اور ساتھ ہی ایک فلسفی کا تفکر بھی پایا جاتا ہے۔

اردو طنزیہ شاعری کے اس دور میں جہاں علامہ اقبالؔ کی شاعری ایک نئے رجحان کا پتہ دیتی ہے وہاں جوشؔ ملیح آبادی کی طنزیہ روش کو بھی کسی صورت میں نظرِ انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ جوشؔ کے یہاں وہ جوشؔ و انہماک اور تندی و تیزی ہے جو لطیف مزاح کی متحمل نہیں ہوسکتی تاہم ان کا یہ کمال ہے کہ وہ ایک لمحہ تو بلند بانگ الفاظ اور پُر جوش انداز تکلم سے ناظر کے احساسات کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے اور دوسرے ہی لمحے اپنے ترکش سے طنز کا ایک ایسا زہر آلود تیر نکالتا ہے جو دل کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے اور جس کی خلش ایک تبسم زیرِ لب بن کر ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ جوش ملیح آبادی کی طنزیہ شاعری میں علامہ اقبالؔ کی طنز کی سی گہرائی نہیں، تاہم وہ روایتی انداز سے مُلا اور زاہد پر بھی طنز کرتے ہیں اور ایک خالص انقلابی کی طرح مہاجن کی حرص و ہوا کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ انسانی عالمگیر ناہمواریوں سے بھی بے نیاز نہیں رہتے، چنانچہ اپنی نظموں، غزلوں اور خاص طور پر اپنی رباعیوں میں انھوں نے انتہائی دلچسپ طریقے سے اور خاص طور پر اپنے طنزیہ لہجے سے انسانی مسائل پر قلم اُٹھایا۔ جوش کے اس طنزیہ لہجے کی مثال ان کے یہ دو اشعار بیان کرتے ہیں:

زاہد رہِ معرفت دکھادے مجھ کو
یہ کس نے کہا ہے کہ سزادے مجھ کو

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کافر ہوں! ہوئی یہ تو مرض کی تشخیص
اب اس کا علاج بھی بتا دے مجھ کو

علامہ اقبالؔ اور جوشؔ ملیح آبادی کے علاوہ احمق پھپھوندوی، چراغ حسن حسرتؔ، عاشق محمد غوریؔ اور پنڈت ہری چند اخترؔ نے بھی طنز و مزاح میں نئے گل بوٹے کھلائے۔ ان کے پیش نظر اصلاح تمدن کا مقصد تھا اور وہ فرد کی محرومی، نارسائی، خود فریبی اور جذباتی نا آسودگی کو اپنے طنز و ظرافت کا نشانہ بناتے ہیں اور ایک بہتر ہیئت اجتماعی کے خواب دیکھتے ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات میں سیاسی، تاریخی اور سماجی ادراک اور عصری تقاضوں کا احساس موجود ہے۔

☆☆☆

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو طنزیہ شاعری کا جدید ترین دور

(نمائندہ شعراء کی روشنی میں)

دوسری جنگ عظیم اور تقسیم ملک کے باعث بعض نئے مسائل اور نئے رجحانات نے جنم لیا۔ بقول وزیر آغا ''یہ دور ظرافت کے ایک نئے رجحان کا نمائندہ ہے جس میں سماجی طنز زیادہ بھر پور اور جامع محسوس ہوتا ہے''۔ اقتصادی مسائل، ہجرت، الاٹمنٹ، سیاسی زندگی کے ہیجان خیز میلانات عظیم قوتوں کے درمیان سرد جنگ اور ریشہ دوانیوں نے سماجی زندگی کو ایک نئے طوفان سے آشنا کیا۔ چنانچہ اس دور کے شاعروں کے یہاں طنز کا ایک نیا لب و لہجہ اور نئے تیور ملتے ہیں۔ انھوں نے قومی اور بین الاقوامی بے اعتدالیوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی۔ وہ چور بازاری، نا انصافی، سیاست کی ہلاکت خیزی اور سماج کے بے تکے اور بے ہنگم عناصر پر طنز کے تیر برساتے رہے، سید محمد جعفری کی نظم ''یو۔این۔او'' ضمیر جعفری کی ''وبائے الاٹمنٹ'' اور مجید لاہوری کی ''ماڈرن آدمی'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

اردو طنزیہ شاعری کے جدید ترین دور سے پہلے ہمارے شعراء حضرات مغرب کے مسموم اثرات کو نشانۂ طنز بناتے آئے تھے اور اگرچہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ مشرق کے باعث ننگ باتیں اور زندگی کے دوسرے حقائق بھی ان کے طنزیہ حملوں کی زد میں آئے، تاہم اس طنز کا دائرہ کچھ زیادہ وسیع نہ ہوسکا اور اسی لیے جب دور جدید کے شعراء نے زندگی اور سماج کے چھپے ہوئے ناسوروں پر تیز نشتر چلانے کا آغاز کیا تو ان کی طنز کی چبھن کو بڑی سختی سے محسوس کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آزادی کے بعد زندگی کے ہر شعبہ میں ایک زبردست تبدیلی آئی اور ایک نئے زاویۂ نگاہ کی تلاش میں ساری قوم نے فکر و عمل کے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

لیے ایک نئے سفر کا آغاز کیا۔ آزادی کا خواب پورا ہو چکا تھا اور اب حقیقت سامنے کھڑی تھی اگر چہ آزادی کی مسرت بڑی بے پایاں تھی مگر ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی شروع ہونے والے فسادات نے آزادی کے خواب کو جھلسا دیا اور سارے برصغیر میں افراتفری پھیل گئی۔ آزادی کے بعد پیش آنے والے واقعات نے ادیبوں اور فنکاروں کی ذمہ داریوں کو اور بھی گرانبار کر دیا۔ انھیں آزادی کے زخمی خواب کی تعمیر نو اور نگہداشت کرنی تھی۔ اصولوں اور سماجی اقدار کی اس شکست و ریخت نے ان کے فرائض کچھ اور بھی بڑھا دیئے۔ اس پسِ منظر میں اردو کے طنز و مزاح نگار شعراء کا جائزہ لیجئے تو پتہ چلے گا کہ اردو کے طنز و مزاح نگار شعراء نے اپنے آپ پر ہنسنے کی شرط کو نہ صرف پورا کیا بلکہ نئے نئے ٹارگٹ تلاش کر کے طنز و مزاح کا اعلیٰ معیار بھی قائم کیا۔

آزادی کے بعد جو طنزیہ و مزاحیہ شعراء منظر عام پر آئے، ان میں شاد عارفی، راجہ مہدی علی خان، دلاور فگار، مجید لاہوری، سید محمد جعفری، سید ضمیر جعفری، فرکت کاکوری، اختر شیرانی، مخمور جالندھری، رضا نقوی واہی، ظریف جبلپوری، حاجی لق لق وغیرہ کے نام سر فہرست ہیں جنھوں نے اس روایت کو آگے بڑھانے کی بھر پور کوششیں کیں۔ اس سلسلے میں شاد عارفی اور راجہ مہدی علی خان کی بعض نظمیں قابل ذکر ہیں۔ جن میں زندگی اور سماج کے بیشتر مریضانہ کیفیتوں اور پنہاں ناہمواریوں کو ہدفِ طنز بنایا گیا ہے لیکن ان دونوں شاعروں کی تخلیقات ردِ عمل کی مختلف صورتوں کی غماز ہیں اور ان میں بڑا تنوع ہے۔ مثلاً شاد عارفی کی بیشتر نظمیں سماج کے مرکز 'گھر' کی بعض ناہمواریوں کو اُجاگر کرتی ہیں اور کبھی ساس اور بہو کے تعلقات، کبھی شادی بیاہ کے اخراجات اور کبھی نصف بہتر کے کمالات کا مضحکہ اُڑاتی ہیں۔ اس کے برعکس راجہ مہدی علی خان کی نظموں میں بعض حقائق کو طشت از بام کر کے خواب پرستوں کی ذہنی اُڑان کو روکنے کی بھی ایک واضح سعی نظر آتی ہے۔ مثلاً ان کی نظم ''چور اور خدا'' میں اگر دعا کی جذباتیت کو نشانہ طنز بنایا گیا ہے تو ''کانے کے آنسو'' میں محبت کی سستی جذباتیت کو رسوا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر جب وہ ان باتوں سے ذرا ہٹ کر ٹھوس حقائق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ''جی بہلے آپ'' اور

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

''ملاقاتی'' جیسی تخلیقات معرضِ وجود میں آنے لگتی ہیں اور طنز کی نشتریت تیز سے تیز تر ہوجاتی ہے لیکن اس سلسلے میں راجہ صاحب کی بہترین نظم ''ایک چہلم پر'' ہے جس میں انتہائی خوبی اور جرأت سے سماج کے بعض دلچسپ رسوم کے مضحک پہلوؤں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

جدید اردو طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی روایت کے سلسلے میں ضمیر جعفری کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی نظم ''عورتوں کی اسمبلی اور وزارت'' ہے جس میں بظاہر تو ایک طرح کی مزاحیہ اسمبلی (Mock Assembly) کا منظر پیش کیا ہے لیکن دراصل اس کا سہارا لے کر نسوانی فطرت کے بعض مخصوص رجحانات پر طنز کی گئی ہے، جس میں سماجی شعور کا فقدان ہے۔ مثلاً ان کی نظم کا یہ بند ملاحظہ کیجیے:

بہ آواز شور و شغب بولتی ہیں — بہ اندازِ غیظ و غضب بولتی ہیں
نہیں بولتی ہیں تو کب بولتی ہیں — یہ جب بولتی ہیں تو سب بولتی ہیں
شہادت کی انگشت اقبال پر ہے
کبھی ناک پر ہے کبھی گال پر ہے

البتہ اس نظم کے بعض ہنگامی حالات سے وابستہ ہونے کے باعث اس زمرے میں نہیں آتے جو عالمگیر انسانی ناہمواریوں سے متعلق ہوتا ہے اور اسی لیے طنزیہ شاعری میں اس نظم کا مرتبہ اتنا ہی بلند نہیں جتنا راجہ مہدی علی خان کی نظم ''بڑی بی'' کا ہے۔

سماجی ناہمواریوں اور عالمگیر انسانی حماقتوں پر طنز کی پہلی رو اگر سامنے آتی ہے تو وہ اردو طنزیہ شاعری کے جدید ترین دور سے ہی شروع ہوتی ہے۔ اس دور کی دوسری اہم رو اگرچہ بالکل نئی چیز نہیں تاہم تازہ واقعات و حالات نے اسے ایک نیا لہجہ ضرور بخشا ہے۔ دراصل اس روش کے پیش رو لسان العصر اکبر الٰہ آبادی تھے۔ جنھوں نے اپنے معاشرے پر خارجی اثرات کو ہدفِ طنز بنایا تھا اور نئے الفاظ نئے نظریات اور تازہ سماجی میلانات کے مضحک پہلوؤں کو اس قدر نمایاں کر کے پیش کیا تھا کہ ناظر کی 'ہنسی' کو تحریک مل گئی تھی۔ دراصل طنز کی اس رو کے پس پشت وہ انسانی جبلّت کارفرما تھی جو ہر اجنبی اور غیر مانوس

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

شے کو خندۂ استہزا میں اڑ دینے کی طرف ہر دم مائل رہتی ہے۔ ویسے اس کے عروج کے لیے سازگار زمانہ بھی وہی ہوتا ہے جب معاشرے کی منجمد فضا میں کسی انقلابی تبدیلی کے باعث بعض ایسے نئے رجحانات جنم لیتے ہیں جو معاشرے کی اقدار سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ 1857ء کے ہنگامے کے بعد رونما ہونے والی ایک ایسی ہی سیمابی کیفیت نے اکبر الہ آبادی کی طنزیہ شاعری کو جنم دیا اور دوسری جنگ عظیم اور 1947ء کی تقسیم ہند کے بعد ایک ایسی ہی صورتِ حال نے بہت سارے جدید طنز نگار شعراء کو ایک خاص انداز میں طنزیہ لہجہ اپنانے پر مجبور کیا۔

اردو کی جدید طنزیہ شاعری کے خاص محرکات وہ حالات بنے جو دوسری جنگِ عظیم اور تقسیم ہند کے وہ دردناک واقعات ہیں اور جس کے باعث ہمارے معاشرے میں بعض نئے رجحانات نے جنم لیا ہے۔ اقتصادی بدحالی، ہجرت اور الاٹمنٹ کے قضیے، سیاسی زندگی کے شدید مد وجذر اور بین الاقوامی معاملات میں دو عظیم قوتوں کے مابین ایک سرد جنگ نے فضا میں ایک ایسی ہی سیمابی کیفیت پیدا کردی، جو یقیناً ہمارے معاشرے کے لیے بالکل نئی ہے۔ چنانچہ ہمارے بعض طنز نگار شعراء نے ایک نئے طنزیہ لہجے سے ملکی اور بین الاقوامی بے اعتدالیوں کو منظر عام پر لانے کا آغاز کردیا اور جہاں کسی زمانے میں لپ اسٹک، پاؤڈر، بے پردگی، ڈارون کا نظریہ، اسکول اور کالج کے معاملات پر ہنسی کو تحریک ملتی تھی وہاں آج الاٹمنٹ، رمضانی، لیڈر، ایٹم بم، سیفٹی ایکٹ، راشننگ، چور بازاری، ووٹ، ٹریفک اور رشوت ستانی کو ہدف طنز بنایا جارہا ہے جو سماجی شعور کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں مثلاً:

وہ بھی ہے آدمی جسے کوٹھی ہوئی الاٹ
وہ بھی ہے آدمی کہ ملا جس کو گھر نہ گھاٹ
وہ بھی ہے آدمی کہ جو بیٹھا ہے بن کے لاٹ
وہ بھی ہے آدمی جو اٹھائے ہے سر پہ کھاٹ
موٹر میں جارہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

رکشا چلا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

('ماڈرن آدمی' مجید لاہوری)

مجید لاہوری کی اس نظم میں طنز کا یہ انداز نظیر اکبر آبادی کی نظم کی یاد دلاتا ہے جس میں ایک آدمی کے ہزاروں روپ پیش کیے گئے ہیں۔ کوئی غریب، کوئی امیر، کوئی اپنے بنگلے میں عیش کر رہا ہے تو کسی کو آرام کرنے کے لیے چھت نہیں ہے۔ دراصل مجید لاہوری نے یہاں طنزیہ لہجہ اپنا کر امیروں پر چوٹ کی ہے، جو اپنی ہی دھن میں مگن نظر آتے ہیں اور وہ غریب اور مفلس، جیسے پیٹ بھر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی، اس کا استحصال کیا جاتا ہے اور انھیں غلامی کی زندگی جینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی دوسری نظم ''جہاں میں ہوں'' میں بھی یہی انداز برتا گیا ہے، یہاں بھی وہی مفلس ہے، جسے بھوکا اور ننگا رکھا جاتا ہے، جسے لوٹ لیا جاتا ہے، جسے خون کے آنسو رُلایا جاتا ہے۔ دیکھئے اس بند کو:

ہلاکت خیزیوں کی میمانی ہے جہاں میں ہوں
نہ ابا ہے نہ باوا ہے نہ نانی ہے جہاں میں ہوں
بس اک شے موت ہے جو خیر سے ملتی ہے بے راشن
وگرنہ ساری چیزوں کی گرانی ہے جہاں میں ہوں
ابھی تک پگڑیوں میں ہے شکوہِ تاجِ سلطانی
ابھی تک رشوتوں کی حکمرانی ہے جہاں میں ہوں
ابھی ہیں چور بازاری کی سینہ زوریاں باقی
غریبوں مفلسوں کا خون پانی ہے جہاں میں ہوں

(''ماڈرن آدمی'' مجید لاہوری)

اردو طنزیہ شاعری کا یہ انداز صرف انہی شعراء تک محدود نہیں رہا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اردو کے جدید سنجیدہ شعراء جو طنزیہ یا مزاحیہ شاعروں کی حیثیت سے نہیں جانے جاتے، کے یہاں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں جو معاشرتی اور سماجی طنز کا حکم رکھتے ہیں اور اس میں کوئی کلام بھی نہیں کہ عصری حسیت کے اظہار کے تعلق سے طنز و استہزاء اس وقت عالمی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ادب کے پہچان ہے اور خاص کر جدید اردو شاعری میں بھی یہ طنزیہ لئے کافی نمایاں ہے۔

جدید اردو طنزیہ شاعری میں ایسے بہت سارے طنز نگار شعراء سامنے آتے ہیں جنھوں نے اپنے طنزیہ لہجے سے اس صنف کو وسعت عطا کی اور سماجی ناہمواریوں اور عالمگیر انسانی حماقتوں پر طنز کے نشتر چلائے۔ دراصل تقسیم اور آزادی کے نتیجے میں ملک میں کچھ ایسے اندوہناک حالات پیدا ہوئے کہ ہنسی کا کال سا پڑ گیا۔ ظرافت نگار ہی نہیں، اچھے بھلے افسانہ نگار اور شاعر بھی طنز میں طبع آزمائی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ طنز کبھی تلخی اور زہرناکی اور کبھی مزاح کی ہلکی ہلکی چاشنی لیے ہوئے دبے پاؤں جدید تخلیق ادب کی شریانوں میں داخل ہونے لگا۔ اس کی مثال وہ شاعر ہیں جن کا ذکر اس باب کے شروع میں ہو چکا ہے۔ لیکن ان میں چند شعراء اپنی فنی خصوصیات کی مزید تفصیل اور توجہ کے مستحق ہیں۔

جناب شاد عارفی

جدید اردو طنزیہ شاعری میں شاد عارفی کا شمار ممتاز اور نمائندہ شعراء میں کیا جاتا ہے، جنھوں نے زندگی کے ہر گوشے پر تنقیدی نظر ڈالی اور اسے طنز و مزاح کا مرکز بنایا۔ جن لوگوں نے شاد عارفی کے کلام کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہوگا وہ بھی گواہی دیں گے کہ سماجی زندگی کا کوئی خام پہلو اُن کی طنز کے نشانے سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ ان کے طنز کی ہمہ گیری پر سودا کا یہ شعر بے ساختہ یاد آتا ہے:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں لیا جائے

لیکن اس سلسلے میں سودا کے شعر کا سہارا کیوں لیا جائے، اپنے طنزیہ لہجے کی وسعت کی صراحت خود شاد عارفی نے اس طور پر کر دی ہے:

آتی ہیں میرے طنز کی چھینٹیں تو سبھی پر
یہ کیا کہ فقط آپ بُرا مان رہے ہیں
عظمتِ فن کی روایات کو مرنے نہ دیا
شعر سے بچ کے کوئی ظلم گذرنے نہ دیا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

یہ محض ان کا دعویٰ نہیں ہے۔ اس دعوے کا ثبوت ان کی ہر غزل سے ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے ماحول اور اپنے عہد کی ہر کج روی، ہر کمزوری، ہر ناہمواری، ہر بے اعتدالی، ہر بد نظمی، ہر بے مہری اور ہر بے راہ روی کو رنگ و نسل اور مذہب کے تعصبات سے بلند تر ہو کر اپنے طنز خاص کا نشانہ بنایا ہے۔[1] ذیل کے چند اشعار دیکھئے:

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھ
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اٹھا لا ساقی
شیخ صاحب، میں سمجھتا تھا مسلماں ہے کوئی

آج کل راتیں بڑی ہیں، اس لیے دن گھٹ گئے
تھے کبھی ہم لوگ بھی شایانِ شان کوئی دوست

اصطلاحاً برے کو بھلا کہہ دیا
یعنی گالی نہ دی رہنما کہہ دیا

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست
بھینس کے آگے بین مجھ سے نہ بجی

جنھیں حقیقت بیان کرنا خلافِ آئین مصلحت ہے
سمجھ رہے ہیں معاشرے میں الگ تغزل کی مملکت ہے

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ان اشعار میں شاد عارفی نے طنزیہ لہجے کو الفاظ و تراکیب

---

1 پروفیسر مظفر حنفی، شاد عارفی ایک مطالعہ، ص 46

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کی شعبدہ گری یا کنایات و استعارات کی مدد سے جنم نہیں دیا بلکہ ایک خاص نقطۂ نظر سے واشگاف انداز میں اپنے عہد کے بعض رجحانات پر براہ راست وار کیا ہے۔ چونکہ شاد عارفی کی شخصیت ڈھکی چھپی، ٹیڑھی ترچھی یا مبہم و پیچیدہ نہیں بلکہ سیدھی صاف کھلی ہوئی اور سادہ ہے، اس لیے ان کا فن بھی، جسے ان کی شخصیت کا عکس کہنا چاہیے، اپنے اندر کوئی اینچ پینچ نہیں رکھتا اور نہایت سادگی و بے باکی سے اپنے حریف کو طنز کا ہدف بنایا ہے۔ شاد عارفی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں، جس طرح دیکھتے ہیں اور جو اثر قبول کرتے ہیں، اسے فکر فردا یا مصلحتِ وقت کو بالائے طاق رکھ کر کسی کی رو رعایت کیے بغیر من وعن بیان کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

یہی ہے شادؔ میں سب سے بڑا عیب
وہی لکھتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے
پیٹھ پیچھے جو کہا تھا وہ کہا منہ پر بھی
فکرِ فردا نے صداقت سے مکر نے نہ دیا
پٹے تحسین وطن، طنز ہمارا فن ہے
ہم کسی خانہ برانداز سے ڈرتے ہی نہیں
ہم سے اس طرح کی امید نہ رکھے دنیا
ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں

بحیثیت مجموعی شاد عارفی نے جہاں سنجیدہ موضوع پر قلم اٹھایا ہے وہاں ان کے طنز میں بلا کی گہرائی پیدا ہوگئی ہے۔ وہ خشک موضوعات پر اپنے منفرد انداز سے روشنی ڈالتے ہیں مگر کچھ اس طرح کہ قاری محض مسکرا کر آگے نہ بڑھ جائے۔ ان کا ہر اشارہ بہت بلیغ اور مکمل ہوتا ہے اور بحسن تمام پڑھنے والے کے دل و دماغ میں پیوست ہوجاتا ہے۔ ان کی تحریریں روایتی سج دھج نہیں بلکہ جدت و ندرت ہے جس سے ان کے صاحبِ طرز انشاء پرداز ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ معاشرے کی دکھتی ہوئی رگوں پر باری باری تیکھے طنز کے نشتر لگاتے ہیں۔ ان کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ ایک زمینی مصرعے سے آسمان کی طرف ایسے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اُڑ جاتے ہیں کہ رفتار اور فاصلے کا احساس تک نہیں ہونے دیتے اور اگلے ہی لمحے پھر اس فضا میں آجاتے ہیں جہاں سے چلے تھے مگر اس طرح کہ قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں اور اشتیاق میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اونچے سماج سے نفرت او رذہنی و فکری انفرادی آزادی کی تبلیغ ان کا مطمع نظر آتا ہے۔ وہ ہر تخلیقی شاعری کی طرح اپنے دو ر کے عدل و انصاف، انسانی قوانین او رنفسیاتی ضرورت کے مابین تفاوت کے گلہ گزار ہیں۔ یہاں ان کا ایک قطعہ ملاحظہ کیجیے:

بلند و پست میں نسبت ہے غیر قانونی
غرور عجز میں رشتہ سماج بکتی ہے
کسی امیر کی لڑکی کسی غریب کے ساتھ
نکاح عیب سمجھتی ہے بھاگ سکتی ہے

جناب سید محمّد جعفرؔی

شاد عارؔفی کے بعد سید محمد جعفرؔی کا نام بھی اردو کے جدید طنزیہ شعراء کی فہرست میں پیش پیش ہے۔ ان کی شاعری میں طنز کا عنصر بہت غالب ہے۔ ان کی طنزیہ شاعری میں سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ سماجی شعور کی بھر پور ترجمانی ملتی ہے۔ ان کی شاعری سے علوم و فنون او رنعت کی وسعتوں کا پتہ چلتا ہے او رذہانت سر تا پا۔ ان کو گذشتہ نصف صدی کا سب سے بڑا طنزیہ شاعر کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اکبرالہ آبادی کے بعد اردو طنزیہ شاعری کی تاریخ میں اگر کوئی قابلِ ذکر نام آتا ہے اور جسے بجا طور پر اکبؔر کے طرز کا بڑا شاعر کہہ سکتے ہیں تو سید محمد جعفرؔی ہی ہیں۔[1] سید محمد جعفرؔی کا دائرہ طنز و ظرافت نہ صرف یہ کہ بہ اعتبار موضوع اکبؔر کی طرح رنگا رنگ اور وسیع ہے بلکہ ان کا اسلوب او رفنکارانہ طرز عمل بھی اکبؔر سے بہت مماثل ہے۔ ایک حیرت انگیز ہم رنگی یہ بھی ہے کہ دونوں عمر بھر سرکاری ملازم رہے اور دونوں ہی نے اپنے طنز و ظرافت کا نشانہ عموماً سرکار و دربار ہی کو بنائے رکھا۔

---

1 ڈاکٹر فرمانؔ فتح پوری، اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے، ص 31

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ساتھ ہی مشرقی اقدار وتہذیب سے بے پناہ لگاؤ کے نتیجے میں جدید مغربی تمدن اور نئی صنعتی اقدار وتہذیب کے جن مفروِ مضحک پہلوؤں کو اکبر نے طنز کا نشانہ بنایا ہے، عام طور پر سید محمد جعفری نے بھی مشرق سے دلدادگی وشیفتگی کے سبب ان ہی پہلوؤں پر اپنی توجہ مبذول کی۔ فرق صرف یہ ہے کہ اکبر کی شاعری میں انیسویں صدی کی تہذیبی و سماجی ناہمواریاں طنز وظرافت کا نشانہ بنی ہیں اور سید محمد جعفری کے طنز وظرافت میں جن بے اعتدالیوں نے جگہ پائی، ان کا تعلق بیسویں صدی کے سماجی وتہذیبی رویوں سے ہے۔ خاص بات یہ کہ دیر تک زندہ ومؤثر رہنے کی جو صلاحیت اکبر کے طنز وظرافت میں ملتی ہے، کم وبیش وہی سید محمد جعفری کے یہاں نظر آتی ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ اپنے اصلاحی مقصد، جاندار اسلوب اور رنگا رنگ موضوعات کی بناء پر سید محمد جعفری اپنے عہد کے اکبر الہ آبادی ہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ دونوں کے طنز میں ایک ہی طرح کی شگفتگی، معصومیت اور تازگی ہے۔ دونوں میں اپنے دور کے سماجی و سیاسی حالات اور ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کا شعور ہے۔ چنانچہ دونوں اجتماعی زندگی کی کمزوریوں اور سیاسی حالات کی ناخوشگواریوں پر بڑے شوخ انداز میں ہنستے ہیں۔ دونوں کو کسی کی تحقیر تا تذلیل مقصود نہیں ہوئی۔ تاہم نا انصافی وظلم کے خلاف ان کے طنز وظرافت میں اجتماعی قوت ضرور نمودار ہوجاتی ہے اور قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اکبر کی طرح سید محمد جعفری بھی دوسرے شعراء کے مصرعوں اور اشعار کی تحریف وتضمین کے ذریعے اپنے کلام میں ایک نیا رنگ بھر دیتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ اکبر عموماً حافظ وسعدی کے اشعار کا سہارا لیتے ہیں جب کہ سید محمد جعفری، غالب اور اقبال سے اپنا کام نکالتے ہیں۔ انتظار حسین لکھتے ہیں:

> ''طنز و مزاح والی شعری روایت کے ذیل میں جعفری صاحب پر لکھنے والوں نے اکبر الہ آبادی کا حوالہ دیا ہے، میں نے بھی دیا ہے۔ مگر اس سلسلہ میں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اکبر الہ آبادی سے جعفری کی شاعری کا رشتہ بس اظہار کی سطح تک ہے یعنی اکبر نے طنز و مزاح کی شاعری کو ہنسی، دل لگی کی سطح سے اٹھا کر اسے ایک فکری سنجیدگی سے روشناس کیا اور شائستگی اظہار

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

سے آشنا کیا، اسے ان کے بعد اگر کسی شاعر نے صحیح معنوں میں اپنایا تو وہ محمد جعفری ہیں۔ مشرقی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب۔ اکبر کی شاعری نے اس تضاد اور تصادم سے غذا حاصل کی ہے۔ محمد جعفری کے یہاں یہ مضمون ذیلی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا سروکار ان معاملات سے ہے جو سماجی، سیاسی نوعیت کے ہیں۔ اہل اقتدار کی خودغرضیاں اور فریب کاریاں ان کی خوشامد پسندی اور ہوس اقتدار۔ اس سے پیدا ہونے والی سماجی نا انصافیاں اور عوامی مصائب و مشکلات۔ اس موضوع کے حساب سے دیکھیں تو محمد جعفری کی شاعری کا رشتہ اکبر سے کہیں جا کر اس شاعر سے ملتا ہے جو اپنی کھری تنقید کی بدولت اپنی جان سے ہاتھ دھو کر بیٹھا۔ میری مراد جعفر زٹلی سے ہے''(1)

سید محمد جعفری اکتسابی شاعر نہیں، فطری شاعر ہیں۔ جعفری کا شمار ان کا ریگرانِ شعر میں نہیں کیا جاسکتا جو محض زبان و بیان پر قدرت، علم و عروض و قافیہ سے واقفیت، کسی اُستاد قسم کے شاعر سے رشتہ تلمذ اور مشق و ریاضت کی بنیاد پر اچھے برے شعر کہنے پر قادر ہوجاتے ہیں اور اس سے انکار بھی نہیں کہ عروض و زبان اور الفاظ و تراکیب کی صحت پر بھی پورے اترتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی شاعری روح شاعری سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتی۔ یہ شاعری نہیں، بے اثر لفظی کاریگری ہوتی ہے۔ اس قسم کے کاریگروں کے برعکس، سید محمد جعفری شعر گوئی کی خداداد صلاحیت لے کر آئے تھے اور اس صلاحیت کے فنکارانہ اظہار کا ان میں سلیقہ بھی تھا۔ یہ سلیقہ مشق و ریاضت کا نہیں بلکہ جزوی طور پر فطرت کا عطا کردہ اور جزوی طور پر ادبی ماحول میں برسوں کے تربیت یافتہ ذوق و شعور کا نتیجہ تھا۔ یہی ذوق و شعور سید محمد جعفری کی شاعری کا اصل رہنما و محرک تھا اور یہ رہنمائی و تحریک اتنی پختہ اور طاقتور تھی کہ ان کی ہر تخلیق میں دل آویزی و توانائی کا رنگِ خاص پیدا کردیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جعفری نے اپنی پچاس سالہ شاعرانہ زندگی میں جو کچھ کہا ہے، خواہ اس کا تعلق ان کے ابتدائی دور ہی سے کیوں نہ ہو، تازگی و شگفتگی اور بے ساختگی و روانی کے آثار لیے ہوئے ہے۔ اس کی مثال ان کی ایسی متعدد نظمیں ہیں جو انھوں نے 1925ء اور 1930ء

1 ماہنامہ 'بزم سہارا' مئی 2010ء ڈاکٹر سید تقی عابدی کا مضمون، ''حکیم طنز و مزاح'' سید محمد جعفری

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کے درمیان یعنی صرف بیس پچیس سال کی عمر میں کہی تھیں۔ ایسی نظموں میں شاید سب سے پرانی نظم ''الیکشن کا ساقی نامہ'' ہے جو میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' اور علامہ اقبالؔ کی اردو نظم ''ساقی نامہ'' کی بحر میں کہی گئی ہے اور زبان و بیان کے اعتبار سے ایسی رواں دواں اور واقعات کی عکاسی کے لحاظ سے اتنی بھرپور ہے کہ قاری کو الیکشن کے مناظر سمیت اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے۔ الیکشن جیسے چلتے پھرتے متحرک واقعے کی تصویر کشی کے لیے بحر کے انتخاب میں سید محمد جعفریؔ کے ذوق نظر کا امتحان تھا اور اس امتحان میں وہ کامیاب بھی ہوئے اور اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ ان کی نظم کے مطالعے کے وقت میر حسن اور علامہ اقبالؔ کی نظمیں خود بخود ذہن میں اُبھر آتی ہیں۔ مثال کے لیے ہم یہاں پر چند اشعار پیش کرتے ہیں:

ہوا خیمہ زن پھر الیکشن بخار — جلوس اور جلسوں کی آئی بہار
رسالوں کا اور روزناموں کا فن — بدلنے لگا اپنا اپنا چلن
ملے طالبِ علم اس جنگ میں — مٹھائی ملائی گئی بھنگ میں
چلی لیڈری پھر اُچکتی ہوئی — اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
ہر اک چھوٹی مچھلی، نگلتی ہوئی — وکیلوں کی ٹولی سنبھلتی ہوئی

پلا ساقیا ساغرِ عقل سوز
الیکشن نہیں آئے گا روز روز
وہ ساغر کہ ووٹر پھنسیں پانچ سات
الیکشن کے چکر میں ہوں شش جہات
وہ ساغر اثر جس کا جنگ و جدل
دماغوں میں ہو ووٹروں کے خلل
اٹھا نغمہ جمہور کے ساز سے
''لڑا دے ممولے کو شہباز سے''

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
ہو پھر پارٹی بازیوں کی وہ جنگ کہ حیرت میں ہو شیشہ بازِ فرنگ
بدلتے رہیں آئے دن پھر وزیر ترقی کو پھر روک دے دار وگیر
رفیقوں میں پھر جُوت پیزار ہے نہ صنعت، نہ حرفت، نہ کردار ہے
گراں خواب مُلا سنبھلنے لگے سیاست کے فتوے اُگلنے لگے
شرابِ کہن پھر پلا ساقیا وہی پہلی گڑ بڑ مچا ساقیا
جو آیا ہے جلسے میں مرد خطیب ہے تقریر اس کی عجیب و غریب

سید محمد جعفری کی ابتدائی نظموں میں ان کی دوسری نظم ''پرانا کوٹ'' ہے جس میں ان کی ظریفانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ ان کے سوچنے کا انداز اور سماجی زندگی کے بارے میں ان کے ذہنی رویوں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ دونوں نظموں میں فی الواقع اس ریا کاری اور دورنگی کا پردہ چاک کیا گیا ہے جو ہماری سیاسی، مذہبی اور سماجی زندگی کو اخلاقی و روحانی طور پر دیوالیہ بنائے دے رہی ہے۔ جمہوریت کے نام پر انتخابات ہوتے ہیں لیکن در پردہ آمریت کے سارے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ سیاسی راہبر جھوٹے وعدے کر کے عوام سے ووٹ حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن ووٹروں کے دکھ درد کا احساس یا اپنے وعدوں کا پاس انھیں ذرا برابر نہیں ہوتا۔ یہی حال مذہبی رہنماؤں کا ہے کہ گفتار کے سوا کردار کے غازی بہت کم ہوتے ہیں۔ سید محمد جعفری کی یہ دونوں نظمیں اسی صورت حال کو پیش کرتی ہیں اور اپنی ظرافت سے اس میں طنز کے تیر برساتے ہیں جس سے یہ بات بالکل عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کی شاعری سماجی شعور کا آئینہ بن جاتی ہے۔ لیکن طنز و مزاح کے ایک معتبر و منفرد شاعر کی حیثیت سے جعفری کی شہرت کا آغاز حقیقتاً قیامِ پاکستان کے بعد ہوتا ہے۔ 1950ء تا 1975ء کے درمیانی عرصے میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے، اسے ان کے سرمایہ شاعری کا بہترین حصہ کہنا چاہیے۔ نہ صرف یہ کہ ان کی بیشتر اچھی نظمیں اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ بلکہ موضوع و مواد کی رنگا رنگی کے دوش بدوش ان کے اسلوب فکر وفن میں وہ استواری و ہمواری بھی اسی زمانے میں پیدا ہوئی ہے جسے ان کی شاعری کی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

مستقل شناخت کہا جاسکتا ہے۔

مذہب اور مذہبی تقریبات کے حوالے سے 'رویتِ ہلال کمیٹی' 'عیدالاضحیٰ' 'وزیروں کی نماز' بھرپور ظریفانہ نظمیں ہیں اور ان کا ہر مصرع طنزِ لطیف کی چبھن لیے ہوئے ہے۔ شعر و ادب کے حوالے سے ''میرا دیوان'' ''نقاد اور اقبال'' ''پکا گانا'' ''طرزِ نو کی شاعری'' ''ایبسٹریکٹ آرٹ'' اور ''ہوٹنگ'' خاصے کی چیز ہیں۔ سیاست کے حوالے سے جعفری نے متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن ''کلرک'' ''یو۔ این۔او'' اور ''وزیر کا خواب'' ہمیشہ زندہ رہنے والی تخلیقات ہیں۔ اگرچہ ان کے موضوعات بظاہر ہنگامی ہیں۔ عام سماجی زندگی سے متعلق نظموں میں ''چور بازاری'' ''رشوت'' ''کھڑا ڈنر'' اور ''ابلیس کی فریاد'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن اس قسم کی نظموں کا جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، معرفت روزمرہ کی زندگی کے بے شمار مسائل و واقعات طنز و ظرافت کی زد میں آگئے ہیں۔ مثال کے لیے ان کی نظم ''یو۔این۔او'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہوا ہے، یہ اقوام عالم کی انجمن ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک اس کے ممبر ہیں۔ لیکن اصل اختیارات بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس انجمن کا مقصد مختلف ملکوں یا قوموں کے مابین پیدا ہونے والے مسائل کا ازالہ ہے اور تنازعات و محاربات کا تصفیہ کرانا ہے لیکن یہ کام اس نے کبھی انجام نہیں دیا بلکہ اصل مقام کے برعکس اس کے طاقت ور اور با اختیار ارکان نے اپنے مفادات و اغراض کی خاطر ہمیشہ دو ملکوں کو یا کئی چھوٹے چھوٹے ملکوں کو باہم لڑانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ سید محمد جعفری نے بڑی چابکدستی سے انجمن کی نا اہلی، کمزوریوں کے ساتھ سرد مہری، بڑی طاقتوں کی بندر بانٹ اور پسماندہ ملکوں کی بے بسی کا نقشہ کھینچا ہے۔ بعض مقامات پر غالبؔ کے اشعار کی برجستہ اور بعض الفاظ کی ظاہری مماثلت یعنی نہرو کے ''مہرو'' کے استعمال سے خاص لطف پیدا کیا ہے۔ مثال کے لیے یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

یو۔این۔او کے پیٹ میں سارے جہاں کا درد ہے
وعدہ فردا پہ ٹرخانے کے فن میں فرد ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

گرچہ پٹواتا فلسطین میں خود اپنی نرد ہے
ایسی قوموں سے خفا ہے جن کی رنگت زرد ہے

کتنا اچھا فیصلہ کرتا رہا کشمیر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یو۔این۔ او، دراصل ہے اک راہوارِ تیز گام
جس پہ انکل سام نے ڈالی ہے ڈالر کی لگام

آگے انکل سام پیچھے جان بُل دونوں سوار
ایشیا میں کھیلتے پھرتے ہیں قوموں کا شکار

''وزیروں کی نماز'' بھی جعفری کی شاہکار نظموں میں سے ہے۔ ہر چند کہ یہ خواجہ ناظم الدین کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے کی تخلیق ہے اور اس میں پولو گراونڈ میں ادا کی جانے والی عیدالاضحیٰ کی ایک نماز کا ذکر ہے، لیکن دراصل اس کا اطلاق اس نوع کی ساری نمازوں اور نماز کے سارے اجتماعات پر ہوتا ہے۔ جن میں سربراہانِ مملکت، وزراء، اعلیٰ افسران اور سیاسی و مذہبی رہنما شریک ہوتے ہیں۔ جعفری نے اس قسم کی نمازوں کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے اور ''وزیروں کی نماز'' کے عنوان سے ایک ایسی بلند پایہ نظم اردو کو دے دی ہے۔ جس میں سیاست و مذہب کے حوالے سے سماجی زندگی کی متعدد ریاکاریوں کا پردہ چاک ہوتا نظر آتا ہے۔ مثال کے لیے یہ اشعار:

عیدالاضحیٰ کی نماز اور وہ انبوہِ کثیر
جب کہ اللہ کے دربار میں تھے پاک وزیر
وہ مصلّوں پہ مسلّط تھے بہ حسنِ تقدیر
تھے رہزروان کے مصلّے یہ مساواتِ کبیر

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

آج کل یہ ہے نماز اور کبھی وہ تھی نماز
ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز

سید محمد جعفری کے یہاں پیروڑی کے بہت اچھے نمونے بھی ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظموں میں ''کیبنٹ مشن'' ''لاالہ الا اللہ'' اور ''آدمی'' کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان کی جس پیروڑی کو سب سے زیادہ شہرت ملی وہ ''طرزِ نو کی شاعری'' ہے۔ اس میں جعفری نے نظم آزاد ہی کی تکنیک کو سامنے رکھا ہے۔ گویا لوہے کو لوہے سے کاٹا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

طرزِ نو کی شاعری کے دیکھئے موضوع بھی
حُریت، نسوانیت، احساس، مفلس کا شباب
چاندنی راتیں، پپیہا، تُو کہاں، سرمایہ دار

سید محمد جعفری اپنے ہاں طنز و مزاح کے عناصر، بالعموم واقعات کی بعض جزئیات، زندگی میں ان کے نتائج و اثرات اور ان کے استعمال کے باب میں ندرتِ خیال سے پیدا کرتے ہیں۔ اس ندرتِ خیال کو بلند آہنگ اور معنی خیز بنانے کے لیے وہ اپنے پسندیدہ شاعروں خصوصاً غالبؔ اور اقبالؔ کے کلام سے بھی جا بجا مدد لیتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کہ ان کے پیشِ نظر مریض نہیں، ہمیشہ مرض ہوتا ہے اور ان کے اندازِ چارہ گری کا یہ وہ رُخ ہے جو ہنسنے ہنسانے کے ساتھ ساتھ اپنے قارئین کو زندگی کرنے کا ایک نیا حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔

جناب ضمیر جعفریؔ

ضمیر جعفریؔ بھی اردو کی جدید طنزیہ شاعری میں اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے نمائندہ شاعروں کی صف میں شامل کیے جاتے ہیں۔ سید ضمیر جعفریؔ اردو کے ان طنز و مزاح نگار شعراء میں ہیں، جنھیں مشاعروں کے حوالے سے ہندو پاک کے گوشے گوشے میں مقبولیت حاصل ہے۔ وہ فی الواقع اردو کے بزرگ شاعر ہیں۔ یہ بزرگی صرف عمر و سال

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کے سبب نہیں بلکہ حسنِ سخن کے اس بلند معیار کے سبب بھی ہے جسے انھوں نے اپنی شاعری میں شروع سے آخر تک برقرار رکھا ہے۔

ضمیر جعفری کا کمال ہے کہ وہ اپنی شاعری میں لفاظی یا لفظوں کی شعبدہ گری سے ظرافت کو جنم نہیں دیتے، بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی واقعے یا صورت حال کے کمزور اور تیج پہلوؤں کا ندرت خیال کی مدد سے، سنجیدہ الفاظ میں، ایسا خاکہ کھینچا جائے تاکہ وہ قاری کے حق میں لطف انگیز اور خوش گوار بن جائے۔ انھیں اپنی اس کوشش میں اکثر جگہ کامیابی ہوئی ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے لفظوں کی مدد سے مزاح کا پہلو پیدا کیا ہے۔ مثلاً

گرد نے ملتان تک اس طرح گردانا مجھے
میری بیوی نے بڑی مشکل سے پہچانا مجھے

سید ضمیر جعفری نے جس طرح اپنی غزلوں میں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کا عنصر پیدا کردیا ہے، اسی طرح انھوں نے اپنی نظموں میں طنز کے ایسے تیر برسائے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ضمیر جعفری کے یہاں وہ پختگی اور ذہنی صلاحیت موجود ہے جو سید محمد جعفری اور اکبرالہ آبادی میں موجود تھی۔ ان کی نظمیں مثلاً 'دین و سیاست'، 'روزے سے ہوں'، 'ماڈرن غزل'، 'مجھے ذوق تماشا لے گیا تصویر خانے میں'، 'پرانی موٹر'، 'عورتوں کی اسمبلی'، 'سفر ہو رہا ہے'، 'شوق کی بلندی'، 'کل شب تنہائی میں'، 'عید کا میلا'، 'ایرانی بہو کا خیر مقدم' وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ جن میں انھوں نے مزاحیہ انداز اختیار کرنے کے ساتھ ہی ساتھ طنزیہ لہجہ اپنا کر (سماج و معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں، بدعنوانیوں، ناہمواریوں اور خباثتوں بڑے واضح اور پُر اثر انداز میں وار کیا ہے) مثال کے لیے ان کی نظم ''مجھے ذوق تماشا لے گیا تصویر خانے میں'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میرے پیش نظر ہے ایک سستے ریٹ کا سنما
یہی لاہور کے مستانے، مستی گیٹ کا سنما
وہ شور اُٹھتا ہے اونچی سیٹیوں کا فحش گانوں کا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کہ جیسے کوئی ہنگامہ، الیکشن کے زمانوں کا
اُدھر پردے سے جیسے ہی کوئی عورت دکھائی دی
کہ بچوں نے ادھر آغوش مادر کی دہائی دی
جو پکچر میں ذرا سا بھی وصالِ یار ہوجائے
تو اہل دل کی پوری زندگی دشوار ہوجائے

اسی طرح ان کی نظم ''دین و سیاست'' جس میں غزل کا سا انداز برتا گیا یا دوسرے لفظوں میں ہم اسے نظم کے بجائے غزل ہی کہہ سکتے ہیں، اس کا بھی انداز دیکھتے چلیں:

مولوی اونٹ پہ جائے ہمیں منظور مگر
مولوی کار چلائے ہمیں منظور نہیں
وہ نمازیں تو پڑھائے ہمیں منظور مگر
پارلیمینٹ میں آئے ہمیں منظور نہیں
حلوہ خیرات کا کھائے تو ہمارا جی خوش
حلوہ خود گھر میں پکائے ہمیں منظور نہیں
علم و اقبال و رہائش ہو کہ خواہش کوئی
وہ بھی ہم سا نظر آئے ہمیں منظور نہیں
احترام آپ کا واجب ہے مگر مولانا
حضرتِ والا کی رائے ہمیں منظور نہیں

مندرجہ بالا نظموں میں طنز کم اور ظرافت کا عنصر زیادہ نمایاں ہیں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ضمیر جعفری صرف ظرافت نگاری سے ہی اپنا کام چلاتے ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی مزاحیہ شاعری کیوں نہ ہو، اس میں بھی کہیں نہ کہیں طنز کا عنصر موجود ہوتا ہے، اس لیے یہ کہنا کہ ضمیر جعفری کے یہاں طنز ہی نہیں ہے، صحیح نہیں ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ضمیر کا کلام پڑھتے ہوئے لوگ ان کے طنزیہ لہجے کو محسوس تو کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی انھیں زیر لب مسکرانے یا ہنسنے پر مجبور کرتے ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

''مافی الضمیر''، ضمیر جعفری کا وہ مجموعہ کلام ہے جس میں غزلیں اور نظمیں دونوں بہ کثرت موجود ہیں۔ جن میں انھوں نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ لہجے سے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں اور بدعنوانیوں کی طرف اشارہ کر کے اور ان پر طنز کر کے سماجی شعور کی نشاندہی کی ہے۔ مثال کے لیے ان کی نظم ''میں روزے سے ہوں'' کے چند اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں، جس میں انھوں نے روزے داروں کا نقشہ کھینچا ہے۔ یعنی بعض روزہ داروں کا روزے میں کیا عالم ہوتا ہے اور وہ کس کس طرح بات بات پر جھنجھلاتے ہیں۔ چند اشعار دیکھئے:

اے میری بیوی! میرے رستے سے کچھ کترا کے چل
اے میرے بچو! ذرا ہوشیار! میں روزے سے ہوں
شام کو بہر زیارت آ تو سکتا ہوں مگر
نوٹ کرلیں دوست، رشتے دار، میں روزے سے ہوں
تو یہ کہتا ہے بہ لحنِ تر کوئی تازہ غزل
میں یہ کہتا ہوں کہ برخوردار! میں روزے سے ہوں

اسی طرح ان کی نظم ''پرانی موٹر'' ہے۔ پرانی موٹر کیسی کیسی الجھن میں ڈالتی ہے اور کیسے کیسے گل کھلاتی ہے، اس کا تجربہ بیشتر کارنشینوں کو ہوگا۔ لیکن اس تجربے کی لفظی تصویر بنانا آسان نہیں ہے لیکن ضمیر جعفری نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

ہمارے ملک میں انگریز کے اقبال کی موٹر
سن اڑتالیس میں پورے اٹھتر سال کی موٹر
وہ چلتی ہے تو دو طرفہ ندامت، ساتھ چلتی ہے
بھرے بازار کی پوری ملامت، ساتھ چلتی ہے
بہن کی التجا، ماں کی محبت، ساتھ چلتی ہے
وفائے دوستاں بہر مشقت، ساتھ چلتی ہے
کبھی بیلوں کے پیچھے جوت کر چلوائی جاتی ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کبھی خالی خدا کے نام پر بجھوائی جاتی ہے
وہ کہتے ہیں کہ اس میں پھر بھی موٹر پائی جاتی ہے

خواتین کی گرم گفتاری اور بسیار گوئی خصوصاً ایسی مجلس میں جہاں صرف خواتین ہوں، ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ ضمیر جعفری نے خواتین کی اس کمزوری کی بہت اچھی تصویر اپنی نظم ''عورتوں کی اسمبلی'' میں کھینچی ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

یہ شانوں پہ زرکار آنچل اچھالے
اِدھر سے اُدھر مست زلفوں کو ڈالے
میاں اور بچے خدا کے حوالے
میں ہاتھ میں نرم فائل سنبھالے
مباحث میں یوں گرم گفتار ہیں سب
کہ بس لڑنے مرنے پہ تیار ہیں سب

''سفر ہو رہا ہے'' زیرِ عنوان نظم ضمیر جعفری نے کراچی کی بسوں اور ان میں سفر کرنے والوں کا نقشہ جس انداز سے کھینچا ہے، وہ ان کی تیز نگاہی اور جزئیاتی مشاہدے پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح ان کی نظم ''شوق کی بلندی'' جس میں ایک شاعر کے پلاٹ خریدنے اور مکان بنانے کی الجھنوں کا دلچسپ تذکرہ کیا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی ضمیر جعفری کے ہاں وہ جوش و انہماک اور تندی و تیزی ہے جو لطیف مزاح کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ تاہم ضمیر جعفری کا یہ کمال ہے کہ وہ ایک لمحہ تو بلند بانگ الفاظ اور پُر جوش اندازِ تکلم سے ناظر کے احساسات کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے اپنے ترکش سے طنز کا ایک ایسا زہر آلود تیر نکالتے ہیں جو دل کی گہرائیوں تک اُتر جاتا ہے اور جس کی خلش ایک تبسم زیرِ لب بن کر ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

راجہ مہدی علی خان

جدید اردو طنزیہ شاعری میں راجہ مہدی علی خان کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ راجہ مہدی علی خان جن کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔ یہاں تھوڑا سا ذکر ان کی شاعری کے بارے میں بھی ضروری ہے۔ خاص کر ان نظموں کا ذکر ضروری ہے جن میں انھوں نے زندگی اور سماج کی بیشتر مریضانہ کیفیتوں اور پنہاں ناہمواریوں کو ہدفِ طنز بنایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ راجہ مہدی علی خان اپنے پہلے مجموعہ کلام ''مضراب'' کے بعد خاموش ہوگئے تھے لیکن یہ خاموشی ایک طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ پچھلے چند برسوں میں راجہ مہدی علی خان نے ایک بے پناہ تخلیقی اُبال کے تحت درجنوں اعلیٰ پائے کی طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں سپردِ قلم کی ہیں۔ یہ نظمیں اب ''انداز بیان اور'' کے نام سے کتابی صورت میں منظر عام پر آگئی ہیں۔ ''انداز بیان اور'' میں راجہ صاحب کا فن اس قدر نکھر سنور کر ہمارے سامنے آیا ہے کہ اب ہم بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے ضمن میں راجہ مہدی علی خان کی حیثیت منفرد اور یکتا دکھائی دے رہی ہے۔ مثال کے لیے ان کی نظمیں 'مجھے جگا دینا'، 'مرزا غالب مال روڈ پر'، 'سسرال کی جیل'، 'ایک چہلم پر'، 'چار بجے'، وغیرہ قابل ذکر نظمیں ہیں جن میں طنزیہ اور مزاحیہ انداز کا ایک خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ مثلاً

رفیقہ ذرا گرم چاول تو لانا
ذکیہ ذرا ٹھنڈا پانی تو لانا
بہت خوبصورت، بہت نیک تھا وہ
ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ
منگانا پلاؤ ذرا اور خالہ
بڑھانا ذرا قورمے کا پیالہ
جدھر دیکھتے ہیں اُدھر غم ہی غم ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کریں اس کا جتنا بھی ماتم وہ کم ہے

(ایک چہلم پر)

یہ ساس ہے کہ شیر چھپا ہے نقاب میں
اللہ کسی کو ساس نہ دیوے شباب میں
حیراں ہوں دل کو روؤں پیٹوں جگر کو میں
سوتی ہے وہ، سنبھالتی ہوں سارے گھر کو میں
ہر ایک سے پوچھتی ہوں کہ دیکھوں کدھر کو میں
ناز و ادا سے تھام کے اپنی کمر کو میں

(سسرال کی جیل)

بیٹھے بٹھائے ہوگی گھر میں مار کٹائی چار بجے
میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی چار بجے
اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دعا نے کام کیا
امّی اور ابّا نے مل کر میرا کام تمام کیا
بیٹھے بٹھائے ان کو سوجھی میری بھلائی چار بجے
میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی چار بجے

(چار بجے)

مندرجہ بالا اشعار سے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ راجہ مہدی علی خان کے یہاں بظاہر تو مزاح کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً راجہ صاحب نے طنز کے پردے میں کبھی ساس اور بہو کی لڑائی، کبھی سماج کی برائی خاص کر سماجی موضوعات کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ دراصل ان کی مزاح نگاری کی خوبی یہ ہے کہ وہ قدم قدم پر ہمیں چونکاتے ہیں۔ ایک سیدھی سادھی سی بات کے بعد کچھ ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ قاری حیران ہوئے بغیر نہیں

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

رہ سکتا ہے، اور اس کے دماغ میں پھلجڑیاں سی چھوٹنے لگتی ہیں۔

جناب مجید لاہوری

اردو طنزیہ شاعری کے جدید ترین دور میں مجید لاہوری بھی نمائندہ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ مجید لاہوری طنز ومزاح کے ایک معتبر شاعر ہیں اور سب جانتے ہیں کہ قابلِ اعتبار طنزیہ شاعری بصارت سے نہیں، بصیرت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور جسے بصیرت کہتے ہیں وہ حواس ظاہری کے تجربات کا جوہر ہوتی ہے۔ بعض نے اس جوہر کو چھٹی حس کا نام دیا ہے۔ بعض نے القا والہام سے تعبیر کیا ہے اور بعض نے خود آگہی وخودشناسی سے موسوم کیا ہے۔ لیکن اہلِ درد اور اہلِ دل کے یہاں اس نے عرفانِ ذات وکائنات یا روشن ضمیری کا نام پایا ہے۔ حق یہ کہ دل کا دروں خانہ روشن ہو تو پھر اسے روزن و در کی ضرورت نہیں رہتی، اور شاید اسی لیے اکثر صاحبانِ روشن ضمیر اپنی ظاہری آنکھیں بند رکھتے ہیں۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔

روشن دلاں حباب صفت دیدہ بستہ اند
روزن چہ احتجاج، اگر خانہ تار نیست

مجید لاہوری کی شاعری ایسے ہی روشن ضمیر فنکار کی شاعری ہے اور روشن ضمیر شاعر وہی ہوتا ہے جو خود کی اور اپنے سماج کی حفاظت کرے، برائیوں کے خلاف احتجاج کرے، خواہ وہ احتجاج تحریری ہو یا تقریری۔ مجید لاہوری کے یہاں وہ تحریری احتجاج جا بجا ان کی نظموں میں ملتا ہے۔ ان کے یہاں سماجی وتہذیبی شعور کے ساتھ وہ اصلاحی اندازِ نظر بھی تاک جھانک لگاتا ہے جو اکبرالہ آبادی کا طرۂ امتیاز ہے۔ اپنی نظم ''لیڈری'' میں وہ کس خوبصورت انداز سے ان لیڈروں پر طنز کے تیر برساتے ہیں جو ووٹ تو حاصل کرتے ہیں لیکن بالآخر کامیاب ہوجانے کے بعد وہ کیا کیا گل کھلاتے ہیں، ملاحظہ ہوں۔

مل اور زمین الاٹ کراتی ہے لیڈری
اور کوٹھیوں پر قبضہ دلاتی ہے لیڈری

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

لنچ اور ڈنر مزے سے اُڑاتی ہے لیڈری
غم ساتھ ساتھ قوم کا کھاتی ہے لیڈری
فرصت ملے تو ٹور پہ جاتی ہے لیڈری

ہم لوگ زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں
ووٹوں کی بھیک لینے جب وہ چل کے آتے ہیں
دے دے کے ووٹ ہم انھیں ممبر بناتے ہیں
کرسی پہ بیٹھ کے وہ ہمیں بھول جاتے ہیں
پھر دور ہی سے جلوہ دکھاتی ہے لیڈری

اپنا جتھا بنا کے وزارت بناتی ہے
جو کچھ بھی اس کو ملتا ہے بس بانٹ کھاتی ہے
محروم جب رہے 'اپوزیشن' میں آتی ہے
ترکش میں جتنے تیر ہیں سب آزماتی ہے
ناکام ہوکے شور مچاتی ہے لیڈری

لازم ہے اس کے واسطے وہ شوروغل مچائے
غم کوئی ہو نہ ہو وہ کیے جائے ہائے ہائے
تہمت کوئی سی بھی وہ حکومت پہ بس لگائے
لکھے بیان اور ''پریس کانفرنس'' بلائے
ہیں جتنے داو پیچ لڑاتی ہے لیڈری

سید ضامن جعفریؔ

سید ضامن جعفریؔ کا شمار بھی اردو کے جدید طنز و مزاح شعراء میں ہوتا ہے، اگرچہ انھوں نے بہت کم لکھا ہے لیکن یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے، انھوں نے بھی طنزیہ لہجہ اپنا کر اردو کی جدید طنزیہ شاعری کو فروغ بخشا۔ سید ضامن جعفریؔ لفظوں کے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

بجائے عموماً خیال کی مدد سے طنز و مزاح کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یعنی قاری کو نظم سے سرسری گذرنے کے بجائے غور و فکر کے ساتھ سننے اور پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ انھوں نے زندگی اور معاشرے کے مسائل پر طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں روشنی ڈالی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مزاح کم اور طنز زیادہ نمایاں ہے۔ اس کی مثال سید ضامن جعفری کے کلام سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے:

وہ کہہ رہے ہیں کہ جمہوریت بحال کرو
مراد یہ کہ ہمارا بھی کچھ خیال کرو
یہ کیا ملک کو پس تم ہی پائمال کرو
اب اقتدار ہمیں دو، تم انتقال کرو
ہے کل کی بات کہ اپنے یہی پرائے تھے
جو یاد ہو تو تمہیں ہم ہی لے کے آئے تھے
تمہاری طرح بہت مستقل مزاج ہیں ہم
اسیر حبِ وطن، کل تھے اور نہ آج ہیں ہم
حریص دولت دنیا و تخت تاج ہیں ہم
دعا کرے کہ دوا کوئی، لا علاج ہیں ہم
بلا سے اپنی، نہ ہوں ساتھ گرم عوام نہیں
بس اقتدار دلادیں پھر ان کا کام نہیں

جناب اختر شیرانی

اختر شیرانی کا شمار بھی اردو کے معتبر، عظیم اور نمائندہ شعراء میں ہوجاتا ہے۔ ان کا طنز بڑا گہرا اور کاری ہوتا ہے۔ بات میں بات پیدا کرنے کا انھیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ سیدھی سادھی زبان کے ذریعے وہ طنز کی بڑی عالیشان عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے چھوٹے موٹے واقعات اور مسائل کی مدد سے بڑے مسائل کی تہہ تک پہنچتے ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

چونکہ اختر شیرانی رومانی شاعر ہیں اس لیے انھوں نے رومانی شاعری کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ لیکن یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اختر شیرانی نے اپنی شاعری کو کسی محدود دائرے میں نہیں رکھا، بلکہ انھوں نے بہت سارے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا لیکن چونکہ رومانی شاعری ان کا خاص موضوع رہا ہے اس لیے انھوں نے زیادہ تر اسی قسم کی شاعری کی۔ ان کے یہاں طنزیہ نظمیں اور غزلیں بھی ملتی ہیں۔ مثال کے لیے یہاں ان کے کچھ اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔

پوسٹ مین اُس بُت کا خط لاتا نہیں
اور جو لاتا ہے پڑھا جاتا نہیں
عاشقی سے کیوں ہم استعفیٰ نہ دیں
ہوٹلوں کا بل دیا جاتا نہیں
شیخ جی موٹر پر حج کو جایئے
عہدِ نو میں اونٹ کام آتا نہیں
فربہی کا طنز کیوں مشتاق پر
تیری چکی سے تو پسواتا نہیں
نہیں پہلے جب تلک رکھوانہ لے
ڈاکٹر اپنے بھی گھر جاتا نہیں

دلاور فگار

جدید اردو طنزیہ شاعری میں ایک اہم نام دلاور فگار کا ہے، جو اپنی ذہانت اور نشتر قلم کی مدد سے طنز نگاری میں اپنے فن کو پوری طرح بروئے کار لائے اور اس کا کافی بلند معیار پیش کیا۔ دلاور فگار کی شاعری کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ غالب جیسے عظیم شاعر سے متاثر نظر آتے ہیں جس کی مثال ان کا شعری مجموعہ ''انگلیاں فگار اپنی'' ہے جو غالب کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے:

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

علاوہ ازیں وہ خود کہتے ہیں کہ وہ طنز و مزاح میں اکبر الٰہ آبادی، سید محمد جعفری، رئیس امروہی، رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری سے متاثر ہیں۔ اُن کا ذہن فکر انگیز جذبوں سے مانوس اور ان کا ذوقِ سخن باشعور سنجیدہ شعری اسالیب سے ہم آہنگ ہے۔ وہ صرف تخلیقی فنکار نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر ایک ایسا اچھا نقاد ادب بھی چھپا ہے جو تخلیق کی راہ میں ان کی رہنمائی بھی کرتا ہے اور بلند پایہ ادب کے مسلسل مطالعے پر انھیں مائل بھی رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کے متعدد عظیم شاعروں کی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ نہ کرتے اور ان کی ظریفانہ شاعری میں زبان و بیان کی فنی پختگی و پاکیزگی کے ساتھ ساتھ بصیرت و بصارت کی وہ دھوپ چھاؤں بھی نظر نہ آتی جو اردو کی عام ظریفانہ شاعری کے برعکس ان کے کلام میں بیشتر جگہ موجود ہے۔

دلاور فگار کی جو تصنیفات اب تک شائع ہو چکی ہیں، ان کی تفصیل یوں ہے:

(1) حادثے (غزلیات)، (2) ستم ظریفیاں (طنزیہ و مزاحیہ کلام)، (3) شامتِ اعمال (طنزیہ و مزاحیہ کلام)، (4) آداب عرض (کتابچہ طنز و مزاحیہ کلام)، (5) انگلیاں فگار اپنی، (6) از سرِ نو (طنزیہ و مزاحیہ کلام)، (7) خوشبو کا سفر (سنجیدہ منظوم ترجمے امریکی اور دیگر ممالک کے شعراء کی نظموں کے)، (8) خوب تر کہاں (سابق صدر امریکہ جمی کارٹر کی خودنوشت) ''Why not the best'' کا اردو نثر میں ترجمہ، (9) مطلع عرض ہے (طنزیہ و مزاحیہ کلام)، (10) سنچری پیش نظر (طنزیہ و مزاحیہ کلام)۔ اتنی ساری کتابوں کی اشاعت دلاور فگار کی شہرت کے لیے کوئی معمولی سفارش نہیں۔

اکبر الٰہ آبادی کے بعد جن شعراء کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری نے سنجیدہ حلقوں میں بلند رتبہ حاصل کر لیا، ان میں دلاور فگار سرفہرست ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اکبر نے جو روایت قائم کی تھی، دلاور فگار نے نہ صرف اس میں توسیع کی بلکہ طنز و مزاح کی نئی جہات اور اطراف کو بھی ابھارا۔ شروع شروع میں دلاور فگار ایک سنجیدہ غزل گو شاعر کی حیثیت

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

سے ابھرے، انھوں نے اپنی شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے کی، جس کی مثال میں، میں صرف ان کے دو اشعار پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ کیجیے:

کچھ قتل تو ہوئے ہیں مگر قاتلوں کے نام
تم ہم سے پوچھتے ہو تو ہم کس کا نام لیں

☆

اس بلندی پر پہنچ کر مجھ کو آواز یں نہ دو
میں قریب آؤں گا، پھر بھی فاصلہ رہ جائے گا

لیکن جلد ہی دلاور فگار اس ڈگر سے ہٹ گئے اور یہ سلسلہ صرف آٹھ سال تک قائم رہا، اس کے بعد وہ طنز و مزاح کی طرف مائل ہوگئے اور اسی رنگ میں رنگ گئے۔ انھوں نے نریش کمار شاد کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

کیا کہوں کیوں بنا ہوں طنز نگار
حادثوں نے بنادیا ہے فگار
شاعری کا مرض ازل سے تھا
پہلے رشتہ فقط غزل سے تھا
رفتہ رفتہ بدل گیا ہے میلان
میں ہوں اب اور طنز کا میدان

دلاور فگار بنیادی طور پر ظرافت نگار ہیں۔ ان کا مزاح ہلکا پھلکا اور لطیف ہوتا ہے۔ کوئی شاعر بلا وجہ طنزیہ و مزاحیہ شاعر نہیں ہوتا۔ حالات اُسے مزاحیہ شاعر بنا دیتے ہیں۔ دلاور فگار جو اچھے خاصے غزل گو تھے، حالات نے انھیں مزاحیہ شاعر بنا دیا۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ وہ فطرتاً شگفتہ مزاج ہیں، دوسری اہم وجہ یہ کہ وہ جن حالات سے دوچار تھے ان کا تقاضا تھا کہ وہ طنز و مزاح کو ذریعۂ اظہار بنائیں۔ دلاور فگار نے انگریزوں کی حکمرانی کا دور بھی دیکھا اور تقسیم ملک کی آزادی کا زمانہ بھی جھیلا۔ آزادی کے چند سال پہلے اور اس کے بعد فتنہ و فساد کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ دلاور فگار ان حالات سے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اس طرح انھوں نے اپنے طنزیہ لہجے سے ان حالات کا اظہار کیا اور سماجی و معاشرتی مسائل کو انتہائی جرأت اور بے باکی کے ساتھ اُجاگر کیا اور فرد کے بجائے ان سماجی رویوں، قدروں اور اداروں کو نشانہ بنایا جو فرد اور معاشرے کو دھیمک کی طرح چاٹتے ہیں۔ ان کے یہاں سیاسی اور معاشرتی موضوع کے علاوہ لفظوں کی تکرار اور اُلٹ پھیر سے طنز پیدا کرنے کے علاوہ عام واقعات میں بھی طنز و مزاح تلاش کرنے کا عنصر موجود ہے۔ مثال کے لیے ان کا یہ قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

حاکم رشوت ستاں فکر گرفتاری نہ کر
کر رہائی کی کوئی آسان صورت چھوٹ جا
میں بتاؤں تجھ کو تدبیر رہائی مجھ سے پوچھ
لے کے رشوت پھنس گیا ہے دے کے رشوت چھوٹ جا

دلاور فگارؔ کی مزاحیہ نظموں کے ساتھ کچھ طنزیہ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ ''غالب کو بُرا کیوں کہو'' ایک سنجیدہ نظم ہے، اس میں غالبؔ کی متضاد طبیعت اور ان کی شاعرانہ خوبیوں کو بحسن و خوبی بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم کا آخری شعر تو غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا آئینہ دار ہے:

پہنچ گیا ہے وہ اُس منزل تفکر پر
جہاں دماغ بھی دل کی طرح دھڑکتا ہے

دلاور فگارؔ نے جن سماجی ناہمواریوں اور معاشرتی برائیوں کو اپنے مخصوص انداز میں طنز کا نشانہ بنایا، اُن کا تعلق بیسویں صدی کے سماجی، تہذیبی اور سیاسی رویوں سے تھا، ان کی طنزیہ شاعری کا یہی وصف ہے کہ وہ کسی فرد کی ذاتی ناہمواریوں کو نہیں بلکہ سماج کی ناہمواریوں کو ضرب لگاتا ہے۔ اس کی مثال دلاور فگارؔ کے اس کلام سے لگایا جاسکتا ہے۔

قوم اور ملک میں لازم تو نہیں یک رنگی
ایک جغرافیہ داں کا یہ خیال اچھا ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

دور کیوں جاتے ہو خود اپنے وطن کو دیکھو
قوم کا حال بُرا، ملک کا حال اچھا ہے

دلاور فگار کے یہاں ایسی بہت ساری نظمیں اور غزلیں ملتی ہیں جن میں انھوں نے سماجی بُرائیوں کی نشاندہی کی ہے اور ان پر اپنے طنز کے تیر برسائے، مثال کے لیے اُن کی ایک غزل جس میں طنز کی بھرپور مثال موجود ہے۔ ملاحظہ ہوں:

دین آدھا رہ گیا، ایمان آدھا رہ گیا
پھر تعجب کیا جو پاکستان آدھا رہ گیا

وہ سمجھتا تھا کہ یہ بھی اشرف المخلوق ہے
آدمی کو دیکھ کر شیطان آدھا رہ گیا

ناپ کر دیکھا تو قد میں کچھ درازی آگئی
تول کر دیکھا تو ہر انسان آدھا رہ گیا

سعی حالی سے ہوئی غالب کی دگنی منزلت
ہاں مگر مرحوم کا دیوان آدھارہ گیا

چور صاحب آپ کو تکلیف تو ہوگی مگر
یہ بھی لیتے جائیں جو سامان آدھارہ گیا

دلاور فگار کے یہاں سماجی شعور کے ساتھ وہ اصلاحی اندازِ نظر بھی تاک جھانک لگاتا ہے جو اکبر الٰہ آبادی کا طرّہ امتیاز ہے۔ ان کی چھوٹی نظموں کے مقابلے میں ان کی طویل نظمیں زیادہ توجہ طلب ہیں۔ توجہ طلب اس معنی میں کہ دلاور فگار لفظوں کے بجائے عموماً خیال کی مدد سے طنز و مزاح کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''ایک گدھا میدانِ سیاست میں'' اور ''میں اپنا ووٹ کس کو دوں'' بھی ہر طرح قابل مطالعہ ہیں اور سماجی زندگی کے کسی نہ کسی قبح پہلو کو اجاگر کر کے غیرت مندی کا احساس دلاتی ہیں۔ بطورِ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

نمونہ ان کی نظم ''ایک گدھا میدانِ سیاست میں'' کے کچھ اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں جو سیاسی و سماجی ماحول کو آئینہ دکھاتی ہے:

کل رات اک گدھے سے ملاقات ہوگئی
ٹائم تو بے تکا تھا مگر بات ہوگئی
کہنے لگا کہ آپ دلاور فگار ہیں
شاعر ہیں بلکہ طنزو ظرافت نگار ہیں
حضرت نے میرے قتل کی ریومر اُڑائی تھی
حالانکہ موت تو مرے قاتل کو آئی تھی
میں نے کہا ''میں آپ کو پہچانتا نہیں
میں نے کچھ بھی آپ کی بابت لکھا نہیں''
کہنے لگا کہ بھول ہی جاتے ہیں مجھ کو لوگ
مطلب کے وقت باپ بناتے ہیں مجھ کو لوگ
میں نے کہا زحمت نا وقت کا سبب
میری گھڑی میں رات کے دو بج رہے ہیں
کہنے لگا کہ آپ سے کچھ خاص کام ہے
ڈریئے نہیں دفاع کا بھی انتظام ہے
میں نے کہا سپرد میرے کون سا ہے کام
کیا مجرموں کی لسٹ میں لکھا ہے میرا نام

رضا نقوی واہی

اردو طنزیہ شاعری کے جدید دور میں رضا نقوی واہی کا شمار ممتاز اور نمائندہ طنز نگار شعراء میں ہوتا ہے۔ واہی نہایت قادرالکلام اور ذہین و فطین طنز گو ہیں۔ ان کی شاعری کا آغاز، ترقی پسند ادبی تحریک کا زمانہ آغاز و ارتقاء ہے۔ ان کی طنزیہ نظموں کے کئی مجموعے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

گذشتہ چند برسوں کے اندر شائع ہوچکے ہیں۔ 1950ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام ''واہیات'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔اس کے بعد کے مجموعے ''طنز و تبسم'' 1963ء میں۔ ''نشتر و مرہم 1968ء میں۔ ''کلام نرم و نازک'' 1972ء میں ''نام بہ نام'' 1973ء میں۔ ''متاع واہی'' 1977ء میں۔ ''شعرستان واہی'' 1983ء میں۔ ''منظومات واہی'' 1992ء میں اور ''ترکش واہی'' 1995ء میں منظر عام پر آئے۔ ان تمام مجموعوں میں واہی کے طرزِ کلام کی شاعرانہ انفرادیت موجود ہے۔

''نام بہ نام'' واہی کا وہ مجموعہ کلام ہے جس میں انوکھی اور نئی قسم کی فنی اختراعات منظوم خطوط کی شکل میں نظر آتی ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ مزاحیہ و ظریفانہ اور طنزیہ شاعری میں یہ اپنی وضع کی نئی چیزیں ہیں۔ ''نام بہ نام'' میں تقریباً بائیس یا چوبیس منظوم خطوط ہیں جو واہی نے ہمعصر ادیب، شاعر اور سیاست داں احباب کے نام فی البدیہہ لکھے ہیں۔ ان خطوط میں عہدِ حاضر کی انسانی طبائع اور نفسیات سے لے کر سیاسی، سماجی، ادبی اور اخلاقی حالات کی عکاسی نہایت فنکارانہ ڈھنگ، ظریفانہ اور مزاحیہ و طنزیہ انداز سے کی گئی ہے۔ ان منظوم خطوط میں سے ایک خط پروفیسر عبدالمغنی کے نام ہے، جو واہی کی نظم ''شعرستان'' میں قلم بند ہوئے ہیں۔ ''شعرستان'' بہت طویل نظم ہے لیکن پھر بھی نمونے کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بھائی مغنی ہوشیار و ہوشیار
لکھ رہا ہوں شاعروں کی آپ بیتی قسط وار

ملک میں مردم شماری سے ہوا یہ آشکار
صرف شاعر ہیں یہاں پر دو کروڑ اکسٹھ ہزار

ان میں بھی دس بیس شاعروں کو چھوڑ کر
سب خدا کے فضل سے ہیں بے عمل، بے روزگار

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

مندرجہ بالا اشعار سے ''شعرستان'' کی تحریک کا اصلی سبب کیا تھا، وہ معلوم ہوگیا۔ اصلی سبب تھا شاعروں کی قابل لحاظ تعداد جس نے ایک الگ اسٹیٹ کا مطالبہ کردیا۔ ان اشعار میں بے روزگاری کے مسئلہ پر جس سلیقہ سے طنز کے نشتر چلائے گئے ہیں وہ ایک دادِطلب چیز ہے۔ مردم شماری کے بعد شاعروں کی دو کروڑ اکسٹھ ہزار تعداد کا انکشاف ہوتے ہی اخبارات نے اس خبر کو اچھالا اور لیڈر قسم کے لوگوں کو جو موقع کی تاک میں رہتے ہیں، سیاست کی دوکان کھولنے اور چمکانے کا سنہرا موقع ہاتھ آگیا۔ آن کی آن میں سیاسی منصوبے تیار ہوگئے اور بغیر کسی تاخیر کے ان پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔ ملاحظہ کیجیے:

چند لیڈر قسم کے حضرات کو موقع ملا
آگئی ان کی خزاں دیدہ قیادت پر بہار
اک اہم اسکیم ان کے ذہن نے تیار کی
جس میں ذاتی اور قومی فائدے تھے بے شمار
لیڈروں کے رکھ کے اس اسکیم کو پیش نظر
اک نئی تحریک کی ڈالی بنائے استوار
شاعروں کی اک الگ اسٹیٹ بننی چاہیے
جس میں ان کو جینے مرنے کا ہو پورا اختیار

مندرجہ بالا آخری شعر اس خطرناک اور سازشی سیاست کو بے نقاب کرتا ہے جو ملک میں تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد بیرونی سامراجی طاقتوں اور ہندوستان کے اجارہ دار سرمایہ داروں کی ملی بھگت سے اندرون ملک جاری ساری رہی جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

رضا نقوی واہی نے سو، سوا سو سے زیادہ ہی طنزیہ و مزاحیہ نظمیں کہی ہیں۔ موجودہ سماج کے کئی اہم سوال ان نظموں میں آگئے ہیں۔ زندگی کے کئی شعبے واہی کے طنزیہ آرٹ کا موضوع بن گئے ہیں۔ انھوں نے بڑی گہرائی سے موجودہ دو رِ حیات کا مطالعہ کیا ہے، جس کا ثبوت ان کی بے شمار ایسی طنزیہ نظمیں ہیں جن میں موجودہ حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ مثلاً ''الیکشن'' میں لیڈروں کے بازار سیاست کی چہل پہل کا نقشہ ہے۔ ''بلیڈ'' میں

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

تاجروں کی منافع خوری کی واقعاتی تصویر ہے۔ ''چاند اور محبوب'' میں بھی چاند سے متعلق ان جدید انکشافات کو بیان کیا گیا ہے جنھوں نے ''چاند'' سے متعلق محبوب و قدیم تصور کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ''زبان'' میں اسمبلی کے اجلاسوں کے سوال و جواب کی وہ کیفیت پیش کی گئی ہے جو سرکاری زبان کی ثقیل اور جدید اصطلاحات میں پھنس کر اپنے مفہوم سے بیگانہ ہوجاتی ہے۔ ''گرومور فوڈ'' میں زیادہ اپجاؤ کے لیے سرکاری مہم کو موضوع بنایا گیا ہے جس کے لیے لاکھوں روپے مختص کیے جاتے رہے لیکن جس کا حاصل صفر ہی رہا۔ ''لیلائے کرپشن'' میں سرکاری دفاتر کی رشوت خوری کے رجحان کی مصوری ہے۔ ''محقق'' جیسا کہ عنوان سے عیاں ہے، ایک ادبی موضوع سے وابستہ ہے۔ اس میں زبان و ادب کے محقق کی سراپا نگاری ہے۔ جس کا شغل ''اوراق پارینہ'' ہی میں منہمک رہنا ہے۔ ''نقاد'' میں ہنگامہ خیز قسم کی ادبی نکتہ چینیوں کی ''تحریری غلط کاریوں'' کا تمسخر ہے۔ ''گویا شاعر'' میں مشاعروں میں دیکھے سنے اور پسند کیے جانے والے ان شاعروں کو موضوع بنایا گیا ہے جنھیں ''بے مغز کلام'' کی بر سر عام تحسین، غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیتی ہے اور جن کی وجہ سے اچھے اور سچے شاعر بھی پس پشت پڑ جاتے ہیں۔ ''یلغار سے انتشار تک'' ایک دلچسپ نظم ہے جس میں ترقی پسندیت سے جدیدیت پسندی تک کے سفر کا بیان ہے۔ نظم ''فہرست حمار'' میں اعداد و شمار فراہم کرنے کے سرکاری ادارے کو نشانۂ طنز بنایا گیا ہے۔ ''نیا ہاتھی'' موجودہ سیاسی لیڈروں کے انداز عمل کا اشاریہ ہے جن کی بدولت جلسوں اور محفلوں کی مصنوعی رونق بڑھتی اور بڑھائی جاتی ہے۔ ''راشن کی دوکان'' میں گرانی اور عوام کی پریشاں حالی کو پیش کیا گیا ہے۔ محض ایک شعر میں دوکان کا منظر دیکھئے:

گندم کے عوض کشتہ گندم کا ہے جلوہ
ہر آن یہ خطرہ ہے کہ ہوجائے نہ بلوہ

''اے لیکچرر'' میں عہد نو کے استاد اور ''میں سٹوڈنٹ ہوں'' میں نئے زمانے کے طلباء کی صلاحیت اور اہلیت کی مصوری ہے۔ ''پروفیسر نامہ'' اور ''پی ایچ ڈی'' بھی موجودہ علمی ماحول کے زبوں معیار کی آئینہ سامانی کرتی ہیں۔ ''انتقال کے بعد'' میں شاعر نے مردہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

پرستی کی روایت کی تفصیل بیان کی ہے۔

مختصراً یہ کہ کلام واہی میں ایک نظم بھی ایسی نہیں جسے بے مقصد کہا جاسکتا ہو۔ ان کی حقیقت نگاری، طنز و ظرافت کے عناصر کی وجہ سے خوش اسلوب ہوگئی ہے۔ نظموں کی اس فکری تحریک کے عنصر کو طنز اور ظرافت نے زیادہ پُر زور اور پُرکشش بنادیا ہے۔ واہی کے شاعرانہ اسلوب کی شوخ و شگفتہ اور حیات آفریں انفرادیت اسی سے نمایاں ہوتی ہے۔

رضا نقوی واہی کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ انھوں نے اکبرالہ آبادی کے شاعرانہ روایت کی توسیع اکبر ہی کی طرح ایک مصلحانہ بصیرت کے ساتھ کی ہے۔ طنز و ظرافت کے عناصر کو انھوں نے نہ صرف تفریح و تفنن کے لیے استعمال نہیں کیا ہے بلکہ ان عناصر کو برتنے کا مقصد اصلاح معاشرہ ہے۔ وہ سطحی لطف سخن یا خیال کی بے مقصد پھلجڑی چھوڑنے کے قائل نہیں رہے ہیں۔ معاشرتی زندگی کی خامیوں، کمزوریوں اور گمراہیوں پر ان کی گہری نگاہ رہی ہے۔ چنانچہ عصری معاشرہ کے استحصال پسندانہ عناصر کی شناخت کے بعد، انسانی قدروں کے لیے مہلک تصورات، میلانات اور انسان دشمن سرگرمیوں پر مہر خموشی ثبت کرنے کو انھوں نے نامناسب تصور کیا اور اپنے تصورات کو طنز و مزاح کے عناصر سے آراستہ کرکے سلیقے اور خوبصورتی سے اپنی نظموں میں پیش کردیا۔

بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رضا نقوی واہی کی شاعری طنزیہ شاعری کی بہترین مثال ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ماحول اور معاشرے کی پراگندگی اور چیرہ دستی پر طنز کیے ہیں۔ ان کے طنز میں نشتریت تو ہے ہی، ساتھ ہی لطافت اور شگفتگی بھی پائی جاتی ہے۔ اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں رضا نقوی واہی نے اپنے اُفکار کے گلہائے رنگا رنگ سے بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ اس کا ثبوت ان کے وہ کئی مجموعہ کلام ہیں جن کا ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ کہا وہ گہرے مطالعے، وسیع و عمیق مشاہدے اور پختہ تجربے پر مبنی ہے۔

☆☆☆

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

حاصل مطالعہ

طنز و مزاح کا مقصد افراد اور معاشرے کی کمیوں اور کج رویوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا ہے اس طرح کہ وہ اس سے محفوظ بھی ہوں، اس سے لطف بھی اُٹھائیں اور اس پر غور بھی کریں۔ افراد اور معاشرے کے رویوں اور حرکتوں میں جو غلط عناصر داخل ہو گئے ہیں، اس کا احساس بھی ہو جائے۔ اگر کوئی طنز و مزاح نگار اپنے طنز و مزاح کے ذریعے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاتا ہے تو وہ یقیناً کامیاب ہے۔

اردو میں طنز و مزاح کی روایت خاصی قدیم ہے اور اولین دور میں بھی اس کے نمونے مل جاتے ہیں۔ جعفر زٹلی سے لے کر سوداؔ تک اور سوداؔ سے لے کر انشاؔ و رنگینؔ تک طنز و مزاح کسی نہ کسی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ اس دور میں کچھ شعراء کبھی اپنے تند و تیز جذبات کی تسکین کے لیے زاہد سے چھیڑ چھاڑ، ہجو اور معاصرانہ چشمکوں کی طرف اور کبھی اپنے انفعالی رجحانات کے زیرِ اثر ریختی کی جانب متوجہ نظر آتے ہیں۔ اردو شاعری میں طنز و مزاح کے اس دور کی ایک نمایاں رَو واعظ محتسب اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ اور شگفتگی رندی و بے باکی کی رَو ہے۔

اودھ پنچ کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے اردو شاعری میں زاہد سے چھیڑ چھاڑ کی رَو اس نفسیاتی محرک کے علاوہ اپنے زمانے کی سماجی بدنظمی، قنوطیت اور ماحول کے نت نئے قواعد و ضوابط کے خلاف ایک ردِّ عمل کے طور پر بھی نمودار ہوئی۔ دراصل اس طویل زمانے میں جمہوریت کے تصور کی عدم موجودگی اور قومی کردار کی بزدلی و ناکردگی کے باعث ملک کے ایک طبقے نے سیاسی و سماجی مسائل پر براہِ راست نکتہ چینی کی۔ اردو شاعری کے جدید ترین دور میں زاہد واعظ اور محتسب ''علامت'' کے طور پر استعمال ہونے لگے اور ان

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کا سہارا لے کر شعراء نے بعض سیاسی اور مجلسی ناہمواریوں کو نشانہ طنز بنایا۔

''اودھ پنچ'' کے معرضِ وجود میں آنے سے طنز و مزاح کی روایت کو ایک موڑ مل گیا اور اردو میں مغربی طرز کی ظرافت در آئی۔ 'اودھ پنچ' کے طنز و مزاح نگاروں نے زیادہ تر شخصیات کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا اور شاعروں اور مضمون نگاروں کا ایک پورا گروہ طنز و مزاح کے حربوں سے ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو نشانۂ تمسخر بنانے لگا۔ اب تک اردو شاعری میں طنز و مزاح کے عناصر مغربی اثرات سے متاثر نہیں تھے، پس جو نمونے پیش ہوئے وہ یا تو فارسی طنز و مزاح کی تقلید میں معرض وجود میں آئے تھے یا پھر اپنے وجود کے لیے بعض اردو شعراء کی اجتہادی روش کے رہین منت تھے لیکن اودھ پنچ کے اجراء سے اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اودھ پنچ جس زمانے میں معرض وجود میں آیا وہ اس کے نمووارتقاء کے لیے مناسب ترین وقت تھا۔

1857ء کے غدر کے ہنگامے نے نہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کی آخری دیوار ہی کو گرا دیا تھا بلکہ پرانے سماج کی تمام بنیادوں کو بھی متزلزل کر دیا تھا۔ مغربی علوم، مغربی معاشرت اور مغربی تہذیب کے اثر سے اب ایک ایسا معاشرتی انقلاب رونما ہوا تھا جس کے باعث سماج دو طبقوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو ابھی تک پرانی اقدار کا ساتھ دے رہے تھے اور نئے ماحول اور نئے خیالات سے کوئی ذہنی سمجھوتہ کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ ان لوگوں میں قدامت پسند مولویوں اور برہمنوں کا وہ طبقہ خاص طور پر زیادہ مشتعل تھا جس کو پرانے نظام میں تو ایک خاص مرتبہ حاصل تھا لیکن جو نئے حالات میں تیزی سے نظر انداز ہو رہا تھا۔ چنانچہ یہ طبقہ ان جدید مغربی اثرات کا سب سے زیادہ مخالف تھا۔

دوسری طرف وہ لوگ تھے جنھیں اپنے قومی کردار کی کمزوری اور پستی کا ہی احساس نہیں تھا بلکہ جو ان کیفیتوں کا اصل موجب اس قدامت پسند ذہنیت کو گردانتے تھے جو ہر ترقی پذیر رجحان کو انتہائی شد و مد کے ساتھ روکتی ہے اور کسی قسم کا سماجی یا ذہنی تبدیلی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ان لوگوں نے پرانے نظام کو مٹتے اور 1857ء کے غدر میں آخری ہچکی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ چنانچہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے اہلِ وطن ایک زوال پذیر معاشرت میں منجمد ہوکررہ جائیں۔ اس کے علاوہ مغربی علوم سے آشنائی اور مغربی تہذیب کے قریبی مطالعے سے ان لوگوں میں اپنی تہی دامن کا احساس پیدا ہوگیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ہوسکے دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں بالخصوص انگریزی قوم کے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر دنیوی ترقی میں برابر کے شریک ہوسکیں۔ مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوؤں میں یہ احساس بہت پہلے پیدا ہوچکا تھا۔ چنانچہ ہندو کالج کی تعمیر اور رام موہن رائے اور دیویندر ناتھ ٹیگور تحریک کے زیر اثر ہندوؤں میں مغربی علوم کے حصول کا رجحان خاصا توانا ہوچکا تھا۔ تاہم غدر کے بعد مسلمان بھی تیزی سے اس راستے پر گامزن ہونے لگے۔

جیسا کہ پہلے بھی راقم الحروف عرض کرچکا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کا یہ دور مختلف رجحانات کے تصادم کا دور تھا۔ تاہم اس دور میں مغربی تہذیب کو اپنانے کی روش ہی سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ صدیوں کے منجمد معاشرے میں یکا یک ایک ایسا اندرونی تموج پیدا ہوگیا تھا کہ ملک کا باشعور طبقہ اندھا دھند مغربی افکار کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کا مقلد بھی ہونے لگا تھا۔ جذباتیت کی رو اپنے عروج پر تھی۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو کسی تبدیلی کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو اپنی روایت اور تہذیب کا دامن چھوڑنے پر آمادہ تھے اوران دونوں طبقوں کا انداز کسی نہ کسی حد تک جذباتی تھا۔ اودھ پنچ کے معرضِ وجود میں آنے کے لیے یہ مناسب ترین وقت تھا کیونکہ ان دونوں طبقوں کے جذباتی ردِعمل کو ہدفِ طنز بنانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی تاکہ ان کے اعمال میں کسی نہ کسی حد تک توازن پیدا ہوسکے، چنانچہ اودھ پنچ کو یہ تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ اس نے جہاں مغرب کی اندھادھند تقلید کو ہدفِ طنز بنایا وہاں اپنے معاشرے کے زوال پذیر عناصر کا مضحکہ بھی اُڑایا اور یوں فضا کو اعتدال پر لانے کی بھرپور کوشش کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں ایسا ادب پیدا ہوا، جو یا تو سماجی اقدار اور مجلسی اور مذہبی ضوابط کا انتہائی سنجیدگی سے علمبردار تھا اور یا عوام کی تفریح طبع اور تنقیدی حس کی تسکین

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کے لیے مناسب تھا۔

'اودھ پنچ' میں لکھنے والوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ جن میں سے کچھ شعراء نے تحریف نگاری اور پیروڑی کا سہارا لے کر اپنے طنزیہ لہجے کو برقرار رکھا، کچھ نے اپنے معاشرے کو ہی پیش نظر رکھا اور کچھ شعراء نے مغربی میلانات کے بعض مکروہ عادات پر بھر پور طنز کیا۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور و معروف اکبر الہ آبادی ہیں جو بجائے خود ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔

اکبر کی شاعری کے موضوعات مغربی تہذیب کے نقائص، اس کے مقلدوں کی بنیت کذائی، غلط طرزِ فکر، ان کی مذہب سے بیگانگی، آزادی نسواں اور سرسید کی تحریک، مغربی تہذیب کی تقلید اور اس کے برے نتائج تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اکبر نے اپنی قوم کو مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید سے بچانے کے لیے ایک تو ان کے غلط طریقہ کار پر تنقید کی اور دوسری طرف اس تہذیب کی خامیوں کو نمایاں کیا تاکہ جو مرعوبیت کی فضا تھی وہ ختم ہو جائے۔

اردو طنزیہ شاعری کے جدید ترین دور سے پہلے ہمارے شعراء مغرب کے مسموم اثرات کو نشانۂ طنز بناتے آئے تھے اور اگرچہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ مشرق کی بعض ننگ باتیں اور زندگی کے دوسرے حقائق بھی ان کے طنزیہ حملوں کی زد میں آئے۔ تاہم اس طنز کا دائرہ کچھ زیادہ وسیع نہ ہو سکا اور اسی لیے جب دورِ جدید کے شعراء نے زندگی اور سماج کے چھپے ہوئے ناسوروں پر تیز نشتر چلانے کا آغاز کیا تو ان کی طنز کی چبھن کو بڑی سختی سے محسوس کیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ 1947ء کی آزادی اور تقسیم ہند کے بعد زندگی کے ہر شعبہ میں ایک زبردست تبدیلی آئی اور ایک نئے زاویۂ نگاہ کی تلاش میں ساری قوم نے فکر و عمل کے ایک نئے سفر کا آغاز کیا۔ لیکن ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی شروع ہونے والے فسادات نے آزادی کے خواب کو جھلسا دیا اور سارے برصغیر میں افراتفری پھیل گئی۔ آزادی کے بعد پیش آنے والے واقعات نے ادیبوں اور فنکاروں کی ذمہ داریوں کو

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اور بھی گرانبار کر دیا۔ انھیں آزادی کے زخمی خواب کی تعمیر نو اور نگہداشت کرنی تھی۔ اصولوں اور سماجی اقدار کی اس شکست و ریخت نے ان کے فرائض کچھ اور بھی بڑھا دیئے۔ اس پس منظر میں اردو طنز و مزاح نگاروں کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ اردو کے طنز و مزاح نگار شعراء نے اپنے آپ پر ہنسنے کی شرط کو نہ صرف پورا کیا بلکہ نئے نئے ٹارگٹ تلاش کر کے طنز و مزاح کا اعلیٰ معیار بھی قائم کیا۔ شاد عارفی، راجہ مہدی علی خان، سید محمد جعفری، سید ضمیر جعفری، دلاور فگار، رضا نقوی واہی، مجید لاہوری، مخمور جالندھری وغیرہ وہ قابل ذکر نام ہیں جنھوں نے نئے نئے اسالیب تلاش کر کے طنز و مزاح کو جلا بخشی اور اپنے طنزیہ لہجے سے ملکی اور بین الاقوامی بے اعتدالیوں کو منظر عام پر لانے کا آغاز کر دیا۔

اردو طنزیہ شاعری کا یہ انداز صرف ان ہی شعراء تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اردو کے جدید سنجیدہ شعراء جو طنزیہ یا مزاحیہ شاعروں کی حیثیت سے نہیں جانے جاتے، کے یہاں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جو معاشرتی اور سماجی طنز کا حکم رکھتے ہیں اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ عصری حسیت کے اظہار کے تعلق سے طنز و استہزا اس وقت عالمی ادب کی پہچان بھی ہے اور جدید اردو شاعری میں بھی یہ طنزیہ لئے کافی نمایاں ہے۔

☆☆☆

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کتابیات

نمبر شمار	مصنف/مرتب	نام کتاب	ناشر	سن اشاعت
1	ابن اسماعیل	اردو طنز و مزاح		1989ء
2	بشریٰ ناہید ادیب (مرتب)	طنز و مزاحیہ نظمیں	مکتبہ علم و فن، منیا محل، دہلی	1965ء
3	تابش صدیقی	مولانا ظفر علی خان کی طنزیہ شاعری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	
4	حاجی لق لق	پرواز لق لق	ڈائریکٹر ریڈیو اسٹیشن، دہلی	1978ء
5	حسن چشتی (مرتب)	مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2001ء
6	حسنین سید محمد	انشائیہ اور انشائیے	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1985ء
7	خواجہ عبدالغفور	طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1983ء
8	دلاور فگار	کلیات دلاور فگار	فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ	2003ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

9	ڈاکٹر خان محمد عاطف (مرتب)	فارسی شاعری میں طنز و مزاح	اردو پبلشرز، دہلی	1945ء
10	ڈاکٹر طاہر تونسوی	طنز و مزاح۔ تاریخ و تنقید	ماہنامہ شانِ ہند، نئی دہلی	1986ء
11	ڈاکٹر قیصر مصباح الحسن	اردو طنز و ظرافت اور سجاد حسین	اردو اکادمی، اتر پردیش	1978ء
12	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی	1981ء
13	ڈاکٹر تاج پیامی	مزاحیہ شاعری اور چند مزاحیہ شعراء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2007ء
14	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	اردو کی ظریفانہ شاعری او راس کے نمائندے	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2004ء
15	ڈاکٹر ہمایوں اشرف (مرتب)	رضا نقوی واہی۔ آئینہ در آئینہ	کاک آفسیٹ پر نٹرس، دہلی	2003ء
16	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2004ء
17	سنبل نگار	اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2001ء
18	شفیق الرحمٰن	دریچے	کتاب والا، پہاڑی بھوجلہ دہلی	1995ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

19	صدیقی، رشید احمد	طنزیات و مضحکات	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامع نگر، دہلی	
20	طارق سعید	اردو طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1996ء
21	عبادت بریلوی	ہماری مزاح نگار	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2001ء
22	فاروقی، محمد احسن	اکبر اور یورپ	علی گڑھ کالج میگزین	1950ء
23	کاکوری غلام احمد فرقت	اردو ادب میں طنز و مزاح	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2001ء
24	مولوی قمرالدین احمد بدایونی	بزمِ اکبر	انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی	1944ء
25	محسن ورک (انتخاب)	بہترین مزاحیہ شاعری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2004ء
26	میراجی	اردو طنز و مزاح	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2004ء
27	مظفر حنفی (مرتب)	شاد عارفی۔ ایک مطالعہ	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	1991ء
28	مظفر حنفی (مرتب)	آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح	اردو اکادمی، دہلی	1990ء
29	مظفر حنفی (مرتب)	ایک تھا شاعر (شاد عارفی فن اور شخصیت)	نسیم بک ڈپو، لکھنو	1950ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

30	نارنگ، گوپی چند	بیسویں صدی میں اردو ادب	ساہتیہ اکادمی، دہلی	2002ء
31	نامی انصاری	آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح	معیار پبلی کیشنز	1997ء
32	نور الرحمٰن	اکبر الٰہ آبادی اور ان کا کلام		
33	نقوی، نور الحسن	فن تنقید اور اردو تنقید نگاری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	2005ء
34	ندوی، عبدالسلام	شعر الہند، جلد اول	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2004ء
35	ندوی، عبدالسلام	شعر الہند، جلد دوم	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2004ء
36	وزیر آغا	اردو ادب میں طنز و مزاح	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	
37	یوسف مثالی (مرتبہ)	مزاحیہ شاعری کا انسائیکلوپیڈیا	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2008ء

☆☆☆

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

موضوع کی مختلف جہات

طنز و مزاح تخلیقی ادب کا وہ حسن ہے جس کی بنیاد ان لطیف اشاروں پر مبنی ہوتی ہے جو طنز نگار کے ماحول کی دین ہے۔ طنز و مزاح کے رنگوں کے مناسب استعمال سے کسی بھی تحریر کو دلکش و دلفریب بنایا جا سکتا ہے، جس کی عمدہ مثالیں ہمارے شعر و ادب میں جگہ جگہ بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ عام طور پر طنز و مزاح کا استعمال ادیب یا مصنف نے اپنی بات کو پر اثر اور باوزن بنانے کے لیے خوب سے خوب تر کیا ہے۔

اگر ہم طنزیہ و مزاحیہ ادب کے نقوش کی نشاندہی کریں تو اس کے ابتدائی رنگ ہمیں نثر کے بجائے نظموں میں نظر آتے ہیں۔ اس کی اوّلین مثال امیر خسروؔ کی کہہ مکرنیاں، دوسخنے اور انمل میں نظر آتی ہے، جن میں بے ربط و بے جوڑ الفاظ کے ذریعے مزاح کے عنصر وجود پاتے ہیں۔ دکن میں یہ رنگ ہمیں قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کے یہاں ملتا ہے۔ ''اودھ پنچ'' اردو طنز و مزاح کی تعمیر میں ایک بنیادی حیثیت کا حامل ہے جس میں اس صنف کے ذریعے سجاد حسین، احمد علی شوق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، مولوی سید عبدالغفور شاہ باز اور اکبر الہ آبادی جیسے سماجی مفکروں نے سیاسی و سماجی تنقید وارتقاء کا بہترین کام لیا اور اس صنف کے سہارے دو مخالف تہذیبوں میں توازن پیدا کرنے کی بھرپور سعی کی۔ ''اودھ پنچ'' سے پہلے بھی سینکڑوں برس پر پھیلا ایک طویل دور جو لوٹ مار، حادثات اور حملوں کا دور رہا ہے۔ ان میں بھی شعرائے کرام کی ایک ایسی ابھرتی ہوئی رو نظر آتی ہے جو فرار اور قنوطیت سے مخالفت کرتے ہیں اور طنز و ہجو کا سہارا لے کر ان حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ اودھ پنچ سے پہلے طنز و مزاح نگاری کی اس راہ میں سوداؔ، فائزؔ دہلوی، حاتمؔ، انشاءؔ، مصحفیؔ، رنگینؔ، نظیر اکبر آدی اور غالبؔ وغیرہ کے نام پیش پیش ہیں۔

طنز و مزاح کی اس ابتدائی روایت میں طنز و ہجو نگاری کے اول اور بھرپور نمونے تلاش کریں تو اس پوری روایت میں نقطہ آغاز کے طور پر جو نام ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے وہ اٹھارہویں صدی کا اشہر شاعر جعفر زٹلی کا ہے، جنہوں نے پہلی بار اپنی شاعری میں اس صنف کا 'بطریق ٹالم ٹول' استعمال کیا ہے۔ مجموعی طور پر اردو شاعری کے ایک سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قدیم و جدید اردو شاعری سنجیدہ، نیم سنجیدہ، طنزیہ، مزاحیہ یا دانش و حکمت پر مبنی اشعار کا ایک نگار خانہ ہے، جسمیں موضوع کے تنوع کے ساتھ لہجے اور لسانی ہنرمندی کا ہر روپ اور ہر رنگ موجود ہے۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ اپنے قدیم شعری سرمایے کی بازیافت سے ہمیں ہر طرح کے اسالیب اظہار کا سراغ مل سکتا ہے۔

زیر نظر کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک اہم کتاب ہے، جس میں برادرم جاوید جہان صاحب نے کافی محنت و مشقت کر کے اردو میں جدید طنزیہ شاعری کا ایک سماجیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ کتاب کے مشمولات اور مندرجات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے موضوع کی مختلف جہات کا بڑی چابکدستی سے احاطہ کیا ہے۔ میں ان کو اس کتاب کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر جوہر قدوسی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

مصنف ایک نظر میں

نام	:	جاوید احمد ڈار
قلمی نام	:	جاوید جہاں
ولدیت	:	مرحوم غلام محمد ڈار
سکونت	:	کہروٹ (کولگام)
تعلیم	:	ایم-اے؛ ایم-فل؛ پی-ایچ-ڈی (زیر تکمیل)
مشغلہ	:	تدریس
قلمی کام	:	ملک کے معروف ادبی رسائل میں ایک درجن سے زائد تحقیقی مقالے شائع ہو چکے ہیں
زیر تکمیل کتاب	:	شبلی اور علی گڑھ کالج

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

یادداشت

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

یادداشت

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

یادداشت

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

یادداشت

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ب کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ سنجیدہ شاعری کے پہلو بہ پہلو طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا سلسلہ روزِ اوّل سے ہی موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے شعرا کی فہرست میں اس نوع کے شاعر ضرور مل جاتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو مزاحیہ شاعری کی مربوط اور مستحکم روایت رہی ہے۔ جعفر زٹلی سے لے کر عہد حاضر کے شعرا مزاحیہ شاعروں نے سماج کی کج روی، نامساعد حالات اور محترم و مثبت سماجی اقدار کی شکست طنزیہ شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اس طویل عرصے کو ایک ترتیب کے ساتھ سمیٹنا جوئے شیر اردو میں جدید طنزیہ شاعری ایک سماجیاتی مطالعہ اس کی ایک کامیاب و عمدہ مثال ہے۔ کی طرح جاوید صاحب کی یہ کوشش بھی نہایت ہی قابل تعریف ہے۔

جاوید صاحب سے میری پہلی ملاقات دہلی میں ایک بین الاقوامی سیمنار "فیض صدی تقریبات" میں ہوئی۔ سیمنار کے اختتام پر اُن سے ہم کلام ہوئے۔ کچھ باتیں ہوئیں، کچھ بحثیں ہوئیں۔ اس مختصر سی ملاقات میں جاوید صاحب وہ باتیں کہہ گئے، جو صرف ایک ادب نواز ہی کر سکتا ہے، اور پھر جب ادب نواز اس بندے کے مضامین مختلف ادبی رسالوں میں دیکھے تو اندازہ ہو گیا کہ ادبی ذوق و شوق رکھنے والا جاوید صاحب بہت جلد اردو دنیا کی بستی میں شامل ہو جائے گا، جسکا پہلا قدم انکی تصنیف کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ میری دعا ہے کہ جاوید صاحب کا یہ قدم ان کے لئے مشعل راہ ثابت ہو، تاکہ وہ اسی طرح اردو ادب کی خدمت کرتے رہیں اور اُردو دنیا کی یہ بستی اور زیادہ آباد و شاداب اور تر و تازہ رہے۔

ڈاکٹر مشتاق صدف
سکریٹری ساہتیہ اکاڈمی، دہلی

ted by
HAYAT PRINTOGRAPHERS
wkadal, Srinagar #2478818-9419525103

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ISBN: 978-81-924010-5-8